

مولانا جلال الدین رومی

ڈاکٹر محمود الرحمن



۲۰۲۵ - ۲۰۲۴
۳

مولانا جلال الدین رومی (احوال و افکار)

ڈاکٹر محمود الرحمن

دوست پبلی کیشنز

اسلام آباد - لاہور - کراچی

2977692

ق 87

LLP11

ضابطہ

ISBN: 978-969-496-299-4

کتاب	:	مولانا جلال الدین رومیؒ
مصنف	:	ڈاکٹر محمود الرحمن
موسم اشاعت	:	2008
مطبع	:	ورڈ میٹ، اسلام آباد
قیمت	:	200.00 روپے

دوست پبلی کیشنز پلاٹ 110، سٹریٹ 15، 1-9/2، پوسٹ بکس نمبر 2958، اسلام آباد

فون: 051-4102784-5 E-mail: dostpub@comsats.net.pk

پیر روی خاک را اکسیر کرد
از غبارم جلوه با تعمیر کرد
(علامه اقبال)

جلیل القدر مصنف اور شاعر بے بدل

شیخ فرید الدین عطارؒ

کے نام!

ہفت شہر عشق را عطار گشت

ماہنوز اندر خم یک کوچہ ایم^۱

(مولانا رومی)

1 اہل معرفت کا کیسا دلنشین فیضان ہے کہ حضرت عطارؒ کی شہرہ آفاق تصنیف ”تذکرۃ الاولیاء“ کے پورے متن کو ”ذکر جمیل“ کے عنوان سے طبع اردو میں تحریر کرنے سے فارغ ہوا تھا کہ نابھہ روزگار رومی پر یہ کتاب لکھنے کیلئے آمادہ کر دیا گیا۔

ترتیب

9	تقدیم
13	حیاتِ رومی : بہ یک نظر
15	نذرِ رومی
17	خاندانی پس منظر
25	نام و نسب، ولادت و بلوغت
31	دعائے عطارؒ
37	تعلیم و تربیت
43	درس و تدریس
48	قرب تبریزی
55	انقلابِ حیات
65	بہ حیثیتِ صوفی باصفا
79	بہ حیثیتِ شاعرِ ہمہ رنگ
92	مثنوی معنوی : ایک جائزہ

108

اقبال، مسجد قرطبہ اور مولانا نائے روم

116

قلم کاروں کا خراج عقیدت

127

انتخاب کلام

201

اختتامیہ

207

کتابیات

تقدیم

دوسری صدی ہجری کے اوائل کا واقعہ ہے۔ سرزمین بلخ کے عظیم شہنشاہ اپنے عالی شان محل میں گہری نیند سو رہے ہیں۔ باوردی دربان تیر و تفنگ اور نیزہ و سناں سے لیس پہرے پر مامور ہیں۔ چور اچکے تو کجا، چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی۔ معاً چھت پر کسی کے چلنے کی چاپ سنائی دی۔ مذکورہ ظنِ الہی فوراً خواب غفلت سے بیدار ہو گئے اور بہ آواز بلند پوچھا: ”کون ہے؟“

”تمہارا دوست ہوں۔ میرا اونٹ گم ہو گیا ہے اور میں اسے تمہاری چھت پر تلاش کر رہا ہوں۔“

”بے وقوف آدمی! چھت پر اور اونٹ؟“ بادشاہ بلخ نے تلخ آ میز انداز میں کہا۔

اوپر سے فوراً ہی جواب آیا: ”اے بے خبر! اس ریشمی لباس اور سونے کے تخت پر خدا کی

تلاش؟“

اس جواب نے ظنِ الہی کو حواس باختہ کر دیا۔ ایک انجانے خوف کی لہر رگ رگ میں سما گئی۔

کروٹ بدل بدل کر رات کٹی۔ صبح ہوئی تو شاہ بلخ حسب معمول دربار عالی شان میں پہنچے۔

پورا دربار اسلحہ بردار سپاہیوں سے اٹا پڑا تھا۔ خنجر و سناں سے لیس افسرانِ حکومت اپنی اپنی جگہ

ایستادہ تھے۔ معاً ایک اجنبی بھرے دربار میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے کے جلال اور رعب پیکر سے

سارے ہی سپاہی دم بخود ہو کر رہ گئے۔ کسی میں اس انجانے آدمی کا راستہ روکنے کی ہمت نہ تھی۔ سب کی

زبانیں گنگ ہو کر رہ گئی تھیں۔ خود بادشاہ بھی حیرت و استعجاب کے عالم میں نووارد کو دیکھ رہے تھے۔
 آنے والا سیدھا تخت طاؤس کی جانب بڑھا اور ٹھیک بادشاہ کے روبرو کھڑا ہو گیا۔ بادشاہ نے
 دریافت کیا: ”تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟“ اس نووارد نے جواب دیا: ”میں ابھی اس کارواں
 سرائے میں اترا ہوں۔“

”تم پاگل ہو گئے ہو۔ یہ کارواں سرائے نہیں ہے۔ یہ میرا محل ہے۔“ تخت پر جلوہ گر بادشاہ نے
 آنے والے کو تنبیہ کے انداز میں کہا۔

”تم سے پہلے اس محل کا مالک کون تھا؟“ اجنبی نے پوچھا۔

”میرے والد تھے۔“ بادشاہ نے کہا۔

”ان سے پہلے؟“

”میرے دادا تھے!“

”اور ان سے پہلے؟“

”میرے پردادا تھے۔“

”اور ان سے پہلے؟“

”میرے فلاں فلاں اجداد تھے۔“

”یہ سب لوگ کہاں چلے گئے؟“ اجنبی نے پوچھا۔

”وہ سب وفات پا کر دنیا سے چلے گئے۔“ تخت پر جلوہ افروز بادشاہ نے جواب دیا۔

”تو پھر یہ کارواں سرائے نہیں تو اور کیا ہے کہ ایک یہاں آتا ہے اور دوسرا چلا جاتا ہے۔“ یہ کہہ
 کر وہ اجنبی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

رات کے واقعہ سے سراسیمہ، پہرہ داروں کے جھار کو توڑ کر دربار میں آنے والے شخص کی گفتگو
 سے ششدر اور اس کے اچانک غائب ہو جانے پر متحیر بادشاہ کے رگ و پے میں آتشِ عشق بھڑک اٹھی۔

اپنی عظیم الشان سلطنت پر لات ماری اور درویشی اختیار کر لی۔ ان کا نام نامی تھا ابراہیم بن ادہم بلخی۔

مذکورہ واقعہ کے ظہور پذیر ہونے کے ٹھیک پانچ سو سال بعد اسی سرزمین بلخ سے تعلق رکھنے والی

1 یہ خواجہ خضر علیہ السلام تھے جوازاں بعد آپ کے استاد بنے۔

اور انہی حضرت ابراہیم بن ادہم بلخیؒ کے خاندان کی ایک مقتدر خاتون کے بطن سے پیدا ہونے والی ایک عظیم و جلیل شخصیت قونیہ میں اپنے آراستہ و پیراستہ دیوان خانے میں تشریف فرما ہے۔ فرش قیمتی قالینوں اور ریشمی غلاف والے گاؤتکیوں سے مزین ہے۔ سامنے ہی خوبصورت ساحوض ہے جس میں ایک فوارہ نصب ہے۔ پانی کی ہلکی ہلکی مرتعش دھاریاں رنگ و نور کا سماں پیش کر رہی ہیں۔ ایک طرف نہایت قرینے سے مجلد کتابیں اور قلمی مسودے رکھے ہوئے ہیں۔ طلبا نہایت مؤدب ہو کر میر محفل کی گفتگو سننے میں منہمک ہیں۔ چند دانشوران وقت بھی شریک بزم ہیں اور خود صاحب محفل نہایت منقش لباس زیب تن کئے جو گفتار ہیں۔ ان کی باتوں میں گلوں کی خوشبو بھی ہے، جملوں میں حکمت و دانش کے موتی بھی ہیں اور پیرایہ بیان میں علم و ادب کی آمیزش بھی!

معا اس بزم دانشوراں اور محفل علم و حکمت میں ایک ایسا شخص داخل ہوتا ہے جس کا لباس بوسیدہ بھی ہے اور بدبو دار بھی! جس کے سر کے بال بے طرح الجھے ہوئے ہیں۔ جس کی آنکھوں میں کچھڑ ہے اور ناک سے رطوبت بھی خارج ہو رہی ہے۔ وہ ننگے پاؤں ہے جو کچھڑ اور گردوغبار سے لتھڑے ہوئے ہیں..... وہ دندنا تا ہوا آیا اور صاف ستھرے فرش پر نہایت بے پروائی سے بیٹھ گیا۔

صاحب محفل کو اس آنے والے شخص کی ادا ایک آنکھ نہ بھائی۔ سوچا یہ دیوانہ بزم علم و حکمت میں کہاں آ گیا۔ لیکن خاموش رہے۔ معاً نو وارد نے ایک مجلد کتاب اپنے گندے اور غلیظ ہاتھوں سے اٹھائی۔ میر محفل تو اس شخص کی آمد سے پہلے ہی دل گرفتہ تھے۔ کتاب اٹھاتے دیکھا تو نہایت تڑش لہجے میں کہا:

”یہ تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔“

آنے والے نے چپ چاپ یہ کتاب رکھ دی۔ عین اسی لمحے اندر سے ایک ملازمہ آئی اور اس نے سرگوشی میں میر محفل سے کچھ کہا۔ وہ فوراً اٹھ کر اندرون خانہ جانے لگے۔ دیگر مہمان حضرات اور طلبا بھی اٹھ اٹھ کر باہر چلے گئے۔ گڈری پوش شخص جوں کے توں بیٹھا رہا۔

جیسے ہی صاحب خانہ اندرون حویلی گئے، نو وارد نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ ساری کتابیں، سارے مسودے، سارے مخطوطے اٹھا اٹھا کر حوض برد کر دیا۔ سطح آب پر گلگوں سماں نظر آنے لگا۔ عین اسی وقت صاحب خانہ باہر تشریف لائے۔ نظر حوض پر پڑی۔ دیکھا ہر چیز سطح آب پر تیر رہی ہے۔ پھر جو مڑ کر دیکھا

تو فرشِ قالین پر ایک کتاب بھی موجود نہ تھی۔ برا فروختہ ہو کر کہنے لگے:

”اے شخص! تُو نے یہ کیا کیا؟ میری ساری زندگی کا اثاثہ پانی میں ڈال کر تلف کر دیا۔“

نو وارد نے غصے بھری یہ باتیں سنیں اور ہاتھ بڑھا کر حوض سے چیزیں نکالنی شروع کر دیں۔

”اب کیا فائدہ ہے نکالنے کا۔ اوراق سلامت بھی رہے ہونگے۔ سیاہی پھیل گئی ہوگی۔

جلدوں کا ستیاناس ہو گیا ہوگا۔“ صاحبِ محفل حزنِ نیا انداز میں بولے۔

”خود دیکھ لو۔“ نو وارد نے نیم باز آنکھوں اور زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ جلے بھٹنے میزبان کو

کہا اور جب صاحبِ علم و دانش نے حوض سے نکالی گئی کتابوں، مخطوطوں اور کاغذوں کو دیکھا اور ہر چیز کو صحیح سالم پایا تو محو حیرت ہو کر کہنے لگے:

”اے شخص! یہ سب کیا ہے؟“

”یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔“ یہ کہا اور اٹھ کر تیزی سے یہ جا وہ جا۔ وہ صاحبِ علم و

دانش، پیکرِ شعور و بصیرت اور مجسمِ فکر و فلسفہ اسی گدڑی نشیں، الجھے بال والے، آنکھوں میں بھری کچھڑ

والے، گرد آلود پاؤں والے شخص کے پیچھے ننگے پاؤں بھاگ رہے تھے، بگ ٹٹ اور بے تحاشا!

بہت دُور جا کر ایک گھنے جنگل میں عجیب شان کی کرامت دکھانے والے اس شخص کو پکڑا اور ان

کے گرد آلود، کچھڑ سے لت پت پاؤں پر اپنا سر نیاز خم کر دیا۔

وقت کے ایک عظیم درویش اور مجذوبِ دوراں حضرت شمس تبریزؒ کے قدم مبارک پر جبیں سائی

کرنے والے اور بلخ کے سابق شہنشاہ کے نواسے جنہوں نے آنا نانا علم و حکمت کے محراب و منبر سے علیحدگی

اختیار کر لی اور خرقہٴ درویشی پہن کر راہِ سلوک و معرفت کی شاہراہ وسیع و عریض پر چل پڑے..... حضرت

جلال الدین رومیؒ تھے اور یہ کتاب انہی کے احوال و افکار کے بارے میں لکھی گئی ہے اس آرزو کے ساتھ:

میری قسمت سے الہی پائین یہ رنگِ قبول

پھول کچھ میں نے چنے ہیں ان کے دامن کے لیے

ڈاکٹر محمود الرحمن

11 فروری 2008ء

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی

اسلام آباد

حیاتِ رومی..... بہ یک نظر

- 1207ء: بمقام بلخ پیدا ہوئے۔
- 1212ء: اپنے والد اور اہلِ خاندان کے ساتھ ہجرت کی اور سمرقند آئے۔
- 1213ء: رومی اپنے والد اور خاندان کے ساتھ بلخ واپس گئے۔
- 1220ء: پھر، اپنے خاندان کے ساتھ ہجرت کر کے نیشاپور آئے۔ اسی سال وہاں سے بغداد آ گئے۔
- 1228ء: مولانا اپنے والد کے ہمراہ حجاز اور شام کا سفر کرتے ہوئے لارندہ تشریف لائے۔ اسی سال لالائی سمرقندی کی بیٹی گوہر خاتون سے مولانا رومی کی شادی انجام پائی۔
- 1229ء: مولانا رومی کے یہاں لڑکا پیدا ہوا جس کا نام سلطان ولد رکھا گیا۔ آگے چل کر یہ صاحبزادے اپنی مثنوی ”ولد نامہ“ کی بدولت مشہور و معروف ہوئے۔ اسی سال آپ قونیہ آئے اور مستقلاً سکونت پذیر ہوئے۔
- 1231ء: مولانا روم کے والد شیخ بہاء الدین ولد کی وفات واقع ہوئی اور آپ ان کے جانشین بنے۔
- 1233ء: مزید اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے مولانا روم حلب روانہ ہوئے۔ پھر وہاں سے دمشق آئے۔
- 1240ء: قونیہ واپس آئے۔ اسی سال آپ کے اتالیق برہان الدین محقق وفات پا گئے۔

1244ء: شمس تبریز قونیہ آئے اور مولانا رومی سے ملاقات ہوئی۔

1246ء: شمس تبریز لاپتہ ہو گئے۔ مرشد کی گم شدگی کے غم میں تیس ہزار اشعار موزوں کئے اور اس دیوان کو شمس تبریز کے نام سے منسوب کیا۔

1247ء: رومی کے بیٹے سلطان ولد شمس تبریز کو شام سے واپس قونیہ لائے۔

1248ء: شمس تبریز ہمیشہ کے لئے قونیہ سے غائب ہو گئے۔ رومی کا اضطراب ناقابل برداشت ہو گیا۔ موسیقی، سماع اور رقص میں محو ہو گئے۔

1250ء: اسی عالم میں صلاح الدین زرکوب سے ملاقات ہوئی اور مولانا نے روم اس کے گرویدہ ہو گئے اور کہا:

یکے گنجے پدید آمد ازیں دکانِ زرکوبی
زہے صورت، زہے معنی، زہے خوبی، زہے خوبی

1261ء: صلاح الدین زرکوبی کی وفات واقع ہوئی تو مولانا نے اپنے مرید حسام الدین چلی کو اپنا ہدم و ہم راز بنا لیا۔ اسی سال چلی کی گزارش کے پیش نظر رومی نے مثنوی لکھنے کا آغاز کیا اور پہلا دفتر لکھا۔

1263ء: دو سال کے وقفے کے بعد دفتر دوم شروع ہوا۔

1273ء: مولانا نے بمقام قونیہ وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔

نذیرِ رومی

وہ جلال الدین رومی

مولوی معنوی

وہ فروزاں مہر و ماہِ آسمانِ فارسی

مثنوی اُن کی بقولِ حضرت جامی

ہے قرآن در زبانِ پہلوی!

وہ دعائے حضرت عطار تھے

اہلِ عرفانِ جہاں کے ذی حشم سردار تھے

آشنائے رمزِ الفت، پیکرِ اسرار تھے

بے کراں دشتِ طریقت میں شعاعوں کے بلند مینار تھے!

علم و دانش کا وسیع و بے کنار و بے نہایت اک سمندر.....

مولوی معنوی!

بے مثال و لازوال وارِ فتح و اعلیٰ گہر.....

مولوی معنوی!

رحمتوں کا، شفقتوں کا اک تناور سا شجر.....

مولوی معنوی!

فکرو فن، فہم و فراست کی درخشاں رہ گزر.....

مولوی معنوی!

خون و یاس ورنج و غم کی ظلمتوں میں اک شرر.....

مولوی معنوی!

کشورِ شعر و سخن کے دائمی شاہِ جہاں

سرزمینِ مثنوی کے وہ منور آسماں

وہ جید و شبلی وادہم کی راہوں کے نشاں

شمس تبریزی کے مسلک کے حقیقی ترجمان!

عشق کا گوہر فروزاں درجینِ مولوی

عظمت و جاہ و جلالت ہم نشینِ مولوی

آسماں سے بھی بلند تر ہے زمینِ مولوی

شاعرِ مشرق سراپا خوشہ چینِ مولوی!

مانندِ رومی نہ گزرا ہے نہ گزرے گا کوئی

ایسا روشن تارا ابھرا ہے نہ ابھرے گا کوئی!

خاندانی پس منظر

ماضی بعید میں بلخ خراسان کا ایک ایسا مقام تھا جو شان و شکوہ سلطنت کے لئے ہی مشہور نہ تھا، بلکہ تہذیب و تمدن، علم و دانش، فکر و فن اور مذہبی اقدار و روایات کے ایک اہم مرکز کی حیثیت سے بھی خاصا معروف رہا تھا۔ یہی وہ دیار قدیم ہے جہاں دنیائے تصوف کے بطل جلیل حضرت شیخ ابراہیم بن ادہم زمانہ بادشاہت میں اس طرح ایوان سلطنت میں تشریف فرما ہوتے تھے کہ پہرے دارسوں کی چالیس تلواریں اور اعصائے سلطنت لے کر آگے آگے خراماں ہوتے تھے اور اسی قدر سونے کی تلواریں اور اعصاء تھامے چوبدار پیچھے پیچھے چلتے تھے۔

لیکن جب، قضا و قدر نے انہیں بوریائے بوذرپر متمکن ہونے کے لئے چن لیا تو جملہ جاہ و حشم، رعب داب، کروفر، حشمت و عظمت..... سارے ہی عوائل یک لخت کافور ہو گئے اور صوفی باصفا بن کر موصوف نے وہ رتبہ عظیم پایا کہ علوم اولیاء کی کلید کہلائے۔ اور اسی سرزمین سے شفیق بلخی، ابو بکر وراق، حاتم اصم اور ابو محمد معرث جیسے اولیائے کامل اٹھے جنہوں نے اپنے وقت کے جنید و عطار اور شبلی و بایزید جیسے بلند مرتبت روحانی پیشواؤں کو متاثر کیا۔ بلخ کے یہ بوریائین بہت بڑے ماہر علوم تھے اور انہوں نے متعدد کتابیں لکھی تھیں۔

یہی وہ جگہ ہے جہاں الکندی جیسی شہرہ آفاق شخصیت کے شاگرد رشید ابوزید بلخی نے جنم لیا اور

آگے چل کر جغرافیہ نویس کی حیثیت سے مشہور زمانہ ہوا۔ ساٹھ کتابوں کے اس بلخی مصنف کا شمار حکمائے اسلام میں کیا گیا ہے۔

یہی وہ شہر قدیم ہے جہاں عالیشان محلات تھے، سر بہ فلک عمارتیں تھیں، پُر شکوہ مساجد تھیں، وسیع و عریض مدرسے تھے، ہزار ہا کتابوں پر مشتمل لائبریریاں تھیں۔ اقتصادی لحاظ سے یہ ایک ایسا دیار تھا جہاں دولت کی ریل پیل تھی۔ کاروبار عروج پر تھا۔ بازار متنوع سامان سے اٹے پڑے تھے۔ نامور مورخ المقدس کے بقول:

”دوسرے ایرانی شہروں کے مقابلے میں بلخ کی سڑکیں زیادہ چوڑی تھیں۔ اس کی مسجدیں خوبصورتی میں بے نظیر تھیں۔ اس کے گھروں کے صحن و دالان خراسان کے تمام شہروں کے صحنوں اور دالانوں سے زیادہ وسیع اور کشادہ تھے۔“

جغرافیائی، تاریخی، تمدنی، اقتصادی، سماجی اور سیاسی لحاظ سے بلخ کو جو فوقیت حاصل رہی ہے، وہ کسی اور علاقے کو کم ہی نصیب ہوئی ہے۔ ظاہر ہے، اتنے اوصاف کے حامل اس شہر بے مثال میں پیدا ہونے والی اور نشوونما پانے والی ہستیاں بھی ستودہ صفات ہوں گی۔ ان کا ہر عمل قابل رشک ٹھہرا ہوگا۔ ان کی ہر بات حکمت و دانش کا پرتو رہی ہوگی۔ ان کا قُرب تسکین و طمانیت کا موجب بنا ہوگا۔ ایسے رجال و ابطال کے سائے میں انسانیت یقیناً بقعہ نُور بنی ہوگی۔

﴿ ایسے ہی معزز و منقش رجال و ابطال میں پیر رومی کے والد سلطان العلماء محمد بن حسین خطیبی المعروف بہ بہاء الدین ولد بھی تھے جو عموماً بہاؤ لد کہلاتے تھے۔ وہ ایک ایسے خاندان کے چشم و چراغ تھے جو پورے صوبہ خراسان میں علم و فضل، حکمت و دانائی اور شریعت و طریقت کی سر بلندی کے لیے مشہور و معروف تھا اور نتیجتاً قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ یہ وہ خانوادہ بلخ تھا جس نے کثیر تعداد میں ایسے فضلاء اور فقہا پیدا کئے تھے جو اپنے جدِ اعلیٰ اور خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی پیروی کرتے ہوئے خراسان کے اس دُور افتادہ مقام میں دین اسلام کی ترویج و اشاعت میں شب و روز منہمک رہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کے آخری رسول حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے سرزمین عرب میں جس دین متین کا حیات آگے پیغام پیش فرمایا تھا، اسے ہزاروں میل دور..... دریائے جیحون کے اردگرد آباد علاقوں میں مشتہر کرنے کا فریضہ یہی خاندان ذی وقار سرانجام دے رہا تھا۔﴾

یہ وصفِ علم و حکمت محض بہاء الدین ولد تک ہی محدود مخصوص نہ تھا بلکہ اس خاندان کی سابقہ نسلوں کے لیے بھی باعثِ اعزاز رہا تھا۔ بہاء ولد کے آباؤ اجداد قرونوں سے مسندِ علم و فضیلت پر متمکن تھے اور ایک عالم کو اپنے سرچشمہٴ علم و دانش سے فیضیاب فرما رہے تھے۔ تشنگانِ طریقت اور طلبائے حقیقت بلند و بالا فیصلوں سے گھرے ہوئے اور آہنی دروازوں سے آراستہ اس شہر بے مثال میں آتے اور اجدادِ رومی کے آگے زانوئے ادب تہہ کر کے علم و دانش کے موتی رولتے۔

خود مولانا نے روم کے دادا بزرگوار پورے دیارِ بلخ میں عزت و تعظیم کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کا نام نامی ابن احمد خطیبی تھا۔ علم و فضیلت میں انہیں نہایت وسیع و بسیط اور ارفع و اعلیٰ مقام حاصل تھا۔ ان کی دانشوری، علوم دینی میں کامل دستگاہ اور شعائرِ اسلامی پر مکمل عبور نے خراسان سے باہر تک کے علاقے میں شہرت و ناموری کے علم گاڑ دیئے تھے۔ نیشاپور جیسے دور دراز مقام کے رہنے والے رضی الدین نے جب احمد خطیبی کا شہرہ سنا تو پاپیادہ چل کر واردِ بلخ ہوئے اور مولانا نے روم کے دادا جان کی شاگردی اختیار کی..... اور اردگرد کے تشنگانِ علم کا پوچھنا ہی کیا۔ وہ ہر لمحہ اور ہر آن دولت کدہٴ خطیبی پر حاضر ہو کر اپنے سینہ ہائے تشنہ کو سیراب کرتے اور حبیب و داداں کی تزئین کا سامان بہم پہنچاتے۔

حضرتِ خطیبی ظاہری علوم کے ہی بحرِ موج نہ تھے، روحانی اقدار و روایات کے علم بردار بھی تھے۔ چنانچہ دلوں کی کثافت دور کرنے اور روحانی بالیدگی کے حصول کے لیے بھی لوگ جوق در جوق درِ خطیبی پر آ کر فیضیاب ہوتے۔ علم و فضل میں یکتائے روزگار خطیبی کی قدر و منزلت کا اندازہ اس امر سے بھی واضح ہوتا ہے کہ مملکتِ خراسان کے جملہ علاقوں سے، چاہے وہ نزدیک ہوں یا دور، حصولِ فتویٰ کے لیے پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل شہرِ بلخ کے انہی بزرگ ترین شخصیت کے پاس آیا کرتے تھے اور آپ کا جاری کردہ ہر فیصلہ اٹل گردانا جاتا تھا۔

قدر و منزلت اور رفعت و عظمت کا یہ سلسلہ مولانا نے روم کے دادا حضرت احمد خطیبی سے چلتا ہوا آپ کے والد گرامی شیخ بہاء الدین ولد تک پہنچا۔ دراصل وہی مسندِ خطیبی کے وارث ٹھہرے اور علم و حکمت، طریقت و شریعت اور فکر و دانش کے سرچشمے کو مسلسل جاری و ساری رکھا۔ اس کی کیفیت کچھ یوں تھی کہ ہر روز صبح سے دوپہر تک علومِ درسیہ کا سبق دیا کرتے تھے۔ بعد نماز ظہر اسرار و رموز اور حقیقت و

معرفت کا درس دیتے۔ ہر دو نشست میں سامعین کا ایک اژدہام ہوتا۔ گویا کھوے سے کھوا چھلتا تھا اور ایک عالم مولانا بہاولد کی گوہر نشانیوں سے ممتنع ہوتا تھا۔

اس درس گاہ میں عوام الناس ہی شریک نہیں ہوتے تھے، اراکین حکومت بھی جوق در جوق آتے اور خطبات بہا سے فیضیاب ہوتے۔ حتیٰ کہ محمد خوارزم شاہ جو سریر آرائے سلطنت تھا، مولانا روم کے والد گرامی حضرت بہاء الدین ولد کا حلقہ بگوش تھا، آپ کی خدمت میں اکثر آیا کرتا اور فکر انگیز درس بہ انہماک سنتا۔

یہی وہ خاندانی پس منظر تھا جس میں دنیائے شعر و سخن کی جلیل القدر شخصیت یعنی مولانا جلال الدین رومی نے آنکھ کھولی، پلے بڑھے اور نشوونما پائی۔ علم و عرفان کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ان کے قدموں تلے بہ رہا تھا۔ فکر و دانش کی عطر بیز ہوائیں ان کے مشام جاں کو مس کر رہی تھیں۔ شعور و آگہی کے خزانے مولانا نے روم کو ورثے میں مل چکے تھے۔ ارد گرد کا ماحول تہذیب و ادب کا عکاس تھا۔ خاندان کے جملہ افراد کا اٹھنا بیٹھنا، بولنا چالنا، ملنا ملانا، سب کچھ اخلاق کریمانہ کا مظہر تھا۔ یہی سارے عناصر ان کی شخصیت کے نکھار سنوار کا سامان ٹھہرے۔

پھر، والد کے ملاقاتیوں میں صاحب علم و دانش بھی تھے، افرادِ ذی مرتبت بھی! علمائے دین بھی تھے اور فضلاء عصر بھی! خود بادشاہ وقت کی آمد جہاں شاہی آداب و احترام کی ضامن تھی، وہاں انداز گفتگو اور طرزِ مخاطب کی داعی بھی تھی۔ ان لحاظ میں ایک طرف شان و عظمت سلطنت ہویدا تھی تو دوسری جانب علم و دانش کا وقار اور حرف و معنی کی عظمت اجاگر تھی۔ ان گونا گوں مناظر اور ایسے متنوع ماحول نے کم سن رومی کی کشتِ حیات کی آبیاری کی اور ایک چھتتا درخت بننے میں مدد و معاون ثابت ہوا۔

اس خانوادہ بہاولد میں آنے والے بھانت بھانت کے لوگ تھے۔ ان کے چہرے کی لکیریں مختلف، ان کا طرزِ مخاطب جدا، ان کے ملنے کا انداز الگ! ان سبھوں کی نشست و برخاست غیر مماثل!..... یہ سب عوامل کم سن رومی کے معصوم ذہن کے نازک پردے پر منعکس ہوتے چلے گئے اور غیر شعور نے ان مشاہدات کو سنبھال سنبھال کر رکھا۔

بلخ میں گزارے ہوئے رومی کے یہ ابتدائی پانچ سال نفسیاتی طور پر حد درجہ اثر انگیز تھے۔ جو

کچھ دیکھا، جو کچھ سنا، پردہ شعور پر چپکتا چلا گیا..... اور جب 1212ء میں والد محترم کے ساتھ کم سن جلال نے سمرقند کا سفر اختیار کیا تو ان کی آنکھیں اردگرد کے ماحول سے چکا چوند ہو گئیں۔ شاہراہ کی دونوں جانب بلند و بالا کہسار، وادیوں میں سرسبز باغات، ہر جانب ہریالی، نوع بنوع کے اثمار اور ہری بھری کھیتیاں..... یہ دلکش مناظر رومی کے پردہ ذہن پر ثبت ہوتے چلے گئے۔

پھر سمرقند جیسے تاریخی شہر میں اہل خاندان کے ساتھ رومی کا ایک سالہ قیام ان کی معصوم معلومات میں اضافے کا سبب ٹھہرا۔ انہوں نے وہاں کے علماء و فضلا کی صحبت ہی نہیں دیکھی، منظر حشر ساماں بھی دیکھا تھا۔ خوارزم شاہ نے سمرقند کا محاصرہ کر لیا۔ شہر کو تاخت و تاراج کیا اور حملہ آور وہاں کے باشندوں کو گرفتار کر کے لے گئے۔ اسی یورش کے موقع پر ایک خوب روٹ کی نے اللہ تعالیٰ سے اپنی حفاظت کی دعا مانگی تھی۔ چنانچہ حملہ آور کی بد نظری، تشدد اور بلاکت سے وہ بچی رہی۔

اپنی چھ سالہ عمر میں نوخیز رومی نے اپنی آنکھوں سے مذکورہ بالا خونیں حادثہ دیکھا تھا جو انہیں یاد رہا اور ان کی تقاریر کے مجموعے ”فیہ مافیہ“ میں قابل ذکر ٹھہرا اس جملے کے ساتھ:

”جو شخص خود کو خدا کے سپرد کر دیتا ہے وہ تمام آفات سے محفوظ و مامون رہتا ہے۔ دربار

خداوندی میں کسی کی دعا ضائع نہیں ہوتی۔“

ذرا غور کیجیے کہ چھ سال کی عمر، کم سنی کا زمانہ، نا تجربہ کاری کا دور، کچے ذہن کے سن و سال..... اور تجزیہ نگاری کی یہ قوت جو باقاعدہ ایک تاریخی حقیقت کی غماز ہے۔ یہ سارے خونچکاں مناظر رومی نے اپنے والد کے زیر سایہ ہی دیکھے۔ اور یہ بھی دیکھا کہ شیخ بہاء الدین ولد اس تباہی و بربادی پر کس قدر دل گرفتہ دکھائی دیتے تھے..... یقین کیجیے کہ حیات رومی کا یہ ایسا خاندانی پس منظر ہے جس نے نوخیز جلال الدین میں تباہی و بربادی پر کڑھنے، عوام الناس کے قتل و غارت گری پر تاسف کرنے اور انسان کی بہبودی و بھلائی کے لیے مثبت اقدامات کرنے پر ابتدائی عمر میں ہی آمادہ کر دیا تھا۔ کیا یہ سب تجربات، مشاہدات اور واردات لوح دل رومی پر اس طرح ثبت نہیں ہوئے کہ آگے چل کر دیوان شمس تبریز کی صورت میں اور مثنوی معنوی کی شکل میں بروئے کار آئے۔

مجھے اس امر کا سخت افسوس ہے کہ کلام رومی کا تجزیہ کرنے والوں نے حیات رومی اور اس کے خاندانی پس منظر کو قطعاً وقعت نہیں دی۔ کاش کوئی ماہر نفسیات مولانا نے روم پر قلم اٹھاتا تو پھر

دنیا دگر ہوتی۔

شیخ بہاء الدین ولد کچھ ہی عرصہ بعد اپنے بیٹے رومی کو ساتھ لے کر واپس بلخ آ گئے۔ واپسی کا یہ سفر بھی ننھے ذہن کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا رہا۔ والد بلخ کے شاہی دربار کی سازشوں سے تنگ آ کر سمرقند گئے تھے کہ سکون و اطمینان کے ساتھ فرائض منصبی انجام دینے کا موقع میسر ہوگا..... مگر مشیت ایزدی کو یہ منظور نہ تھا۔ وہاں کشت و خون کا ماحول دیکھ کر وہ واپس اپنی جنم بھومی کی طرف لوٹے..... سمرقند کا یہ سفر شیخ بہا ولد کے لیے یقیناً روح فرسا رہا ہوگا، لیکن ان کے کم سن بچے کے لیے آنے والی زندگی اور شروع ہونے والی سخن سنجی میں نہایت فعال کردار ادا کرنے کا سبب بن گیا۔

اپنی جنم بھومی کی طرف ”یہ خاندانی“ واپسی رومی کے لیے مزید حزن و ملال کا باعث ٹھہری۔ ہر طرف خوف و ہراس کا عالم طاری تھا۔ اہالیان بلخ شدید ذہنی کرب میں مبتلا تھے۔ مغل فوج کا سالار، خان اعظم یعنی چنگیز خاں شہروں، بستیوں، قریوں اور دیہاتوں کو مسمار کرتا، ہر ایک مفتوحہ مقام پر مقتولین کی گردنوں کے مینار سجاتا ہوا صوبہ خراسان کی جانب رواں دواں تھا۔ لوگ گھر چھوڑ چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔ عزت و آبرو بچانے کا خیال مال و منال کے تحفظ پر فوقیت حاصل کر گیا تھا۔ پھر جان ہے تو جہان کا کلیہ حرز جاں بن چکا تھا۔

یہ لمحہ دلخراش جہاں شیخ بہاء الدین ولد کے لیے سوہان روح بنا ہوا تھا، وہاں دس گیارہ سالہ جلال الدین رومی کے لیے کچھ کم باعث حزن و ملال نہ تھا۔ ابھی ابھی تو اس نوخیز لڑکے نے سمرقند میں قتل و غارت گری کا بازار دیکھا تھا، پابجولاں عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کی چیخ پکار سنی تھی، ہر طرف بہتے ہوئے انسانی لہو دیکھے تھے، خاکستر مکانات اور اڑبڑے ہوئے باغات پر غم انگیز نگاہ ڈالی تھی..... اور اب خود اس نوجوان نابغے کا اپنا وطن بلخ ظالم و سفاک منگولوں کی خون آشام تلواروں اور دندناتے ہوئے گھوڑوں کے نوکیلے فولادی سموں کی زد پر تھا۔

ایسے پر آشوب حالات میں تیرہ سالہ رومی کو اپنے گھر والوں کے ہمراہ پھر رخت سفر باندھنا پڑا اور اس نوجوان کو یہ بتا دیا گیا تھا کہ اب آگے ہی آگے جانا ہے، لوٹ کر نہیں آنا ہے۔ ممکن ہے بڑی عمر کے افراد خاندان اس دوسرے سفر پر اس درجہ مغموم و مضحل نہ ہوئے ہوں کہ پختگی عمر نے انہیں صبر و تحمل کی قوت ودیعت کر دی تھی..... لیکن اس نوجوان کے لیے یہ بات ہرگز قابل برداشت نہ تھی۔ وہ عام سا

نوجوان نہ تھا۔ وہ ایک حساس دل کا مالک تھا۔ اس کا سینہ گداز تھا۔ اسے اپنے آباؤ اجداد کی دہلیز دل و جاں سے زیادہ پیاری تھی۔ وہ گلیاں چھوٹ رہی تھیں جہاں اس نے بچپن کے دن کھیل کود میں گزارے تھے۔ وہ چھتیس، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آنکھوں سے اوجھل ہونے والی تھیں جن کے درمیان وہ چھلانگیں لگاتا تھا۔ وہ کھیت کھلیان، وہ باغات، وہ نہریں، وہ عالیشان عمارتیں، وہ سنہری مسجدیں اور وہ وسیع و عریض عیدگا ہیں اب قصہ پارینہ بننے والی تھیں۔

اسی بوجھل دل اور پُراشک آنکھوں کے ساتھ جلال الدین رومی خاندان والوں کے ساتھ اس طرح بلخ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہوئے کہ شعور کی لہروں پر غم انگیز تاثر متحرک تھا۔ یہ ایک ایسی کسک تھی جو تمام عمر ان کے نہاں خانہ دل پر شبخوں مارتی رہی۔ یاد ماضی کا سوتہ کبھی بھی سینہ رومی میں خشک نہیں ہوا۔ اور یہی وہ دہلی دہلی چنگاری تھی، جب شعلہ جوالہ بنی تو یہ تیرہ چودہ سالہ جوان آگے چل کر محض مولانا جلال الدین نہ تھا، بلکہ مولوی معنوی بھی تھا، ایک ضخیم ”دیوان“ کا شاعر اور ”ہست قرآں در زبان پہلوی“ کا خالق بھی تھا۔

جب قافلہ بہاولد نیشاپور وارد ہوا تو اس دور کی عظیم و جلیل شخصیت، حضرت شیخ فرید الدین عطار بلخ سے آنے والے جید عالم اور معروف دینی رہنما شیخ بہاء الدین سے ملنے تشریف لائے۔ موصوف کی دور رس نگاہ نے نوجوان رومی کے معصوم چہرے کو دیکھتے ہی یہ بھانپ لیا تھا کہ ”اس چیزے دیگرست!“ پھر شیخ بہاولد کے اس قدر داں شخص نے ان کے بیٹے رومی کو نہایت شفقت آمیز انداز میں سینے سے لگایا اور خود پدر گرامی سے یہ برملا کہہ دیا:

”ان صاحبزادے کے جوہر قابل سے غفلت نہ برتنے گا۔“

ساتھ ہی اپنی مثنوی ”اسرار نامہ“ نوجوان رومی کو پڑھنے کے لیے دی۔ حضرت عطار کی گزارش اور ”اسرار نامہ“ کی پیشکش دراصل اس بات کی غماز ہے کہ خاندان بہاولد کے اس نوخیز رکن کا چہرہ مہرہ آنے والے دور کی صریح اور صاف جھلک دکھا رہا تھا۔ وہ چہرہ جو زندگی کے نصف اول میں مسند علم و فضیلت پر مہرتاباں کی طرح چمکنے والا تھا اور نصف دوم میں حسن تصوف کا پیکر بن کر سرتاج شعرائے عالم کی جلوہ گری کا مظہر بننے والا تھا۔

یہ قافلہ بلخ نیشاپور میں ہی ٹک کر نہیں رہ گیا بلکہ وہاں سے آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا.....
 بغداد پہنچا، حجاز آیا، شام میں وارد ہوا..... تا آنکہ لارندہ ہوتا ہوا قونیہ میں مستقل سکونت پذیر ہو گیا۔ یہ
 سفر ہائے دراز، جواہل خاندان کے جلو میں طے ہو رہے تھے، نوخیز رومی کی حیات کا ایک ایسا طربناک
 پس منظر بنتے چلے گئے جس نے انہیں مشاہداتِ عالم کا ایک بحر ذخار عطا کر دیا..... جس کی لہریں نہاں
 خانہ دل میں جمتی چلی گئیں۔

جب 1245ء میں یعنی عمر رومی کے 38 ویں سال، شمس تبریز بساطِ جلال الدین پر وارد ہوئے
 تو اس پس منظر کی مخفی لہروں میں ارتعاش نمایاں ہوا۔ پھر اگلے ہی سال گمشدگی شمس کے ہجر آ میز بھاری
 پتھر نے بحر حیات رومی میں جوز بردست طلاطم پیدا کر دیا، وہی شہرہ دوامِ جلال الدین بلخی المعروف بہ
 مولوی معنوی کا موجب ٹھہرا۔

ذرا ایک لمحے کے لیے توقف کر کے غور کیجیے کہ مولانا نے روم کا یہ خاندانی پس منظر ان کی زندگی
 کی بنیاد ڈالتا رہا، اس کے خدوخال مرتب کرتا رہا، اس کے فارمیٹ کو متعین کرتا رہا، رگ و پے میں
 ولولے پیدا کرتا رہا، مشاہدات و تجربات کے انمول موتی بکھیرتا رہا۔ اور جب ڈھانچہ تیار ہو گیا، جب
 زمین پوری طرح ہموار ہو گئی، اور جب علم و فضیلت کے پھریرے نے چہار دانگ عالم میں رومی کو
 روشناس کرا دیا تو پھر ایک مست قلندر نے آ کر ایسا بھونچال پیدا کر دیا کہ ظاہری شان و شکوہ تو باقی نہ رہا،
 مگر من کی دنیا اس طرح سنور گئی کہ وہ تمام لہریں جو نہاں خانہ دل میں مخفی تھیں، بحر موج بن کر ابھر
 آئیں اور جلال الدین نے ایک نیا جنم لیا، مولوی معنوی کے روپ میں..... بینظیر، بے مثال، ابدالآباد
 تک کے لئے!

نام و نسب..... ولادت و بلوغت

محمد	:	نام
جلال الدین	:	لقب
مولانا مائے روم	:	عرفیت
مولانا رومی		
مولانا روم		
خداوندگار		
مولانا خداوندگار		
مولوی		
مولانا		
مولوی معنوی		
رومی		
محمد المعروف بہ بہاء الدین ولد/ بہاولد	:	ولدیت
محمد	:	نسب نامہ

بن محمد

بن حسین المعروف بہ خطیبی

بن احمد

بن قاسم

بن مسیب

بن عبداللہ

بن عبدالرحمن

بن ابی بکر الصدیقؓ

تاریخ ولادت : 30 ستمبر 1207ء

بمطابق 6 ربیع الاول 604ھ

مقام : بلخ (صوبہ خراسان)

جیسا کہ ہم گزشتہ باب میں ذکر کر آئے ہیں، مولانا نے روم کا خاندان اپنے علم و فضیلت اور حکمت و دانش کی وجہ سے پورے خطے میں ادب و احترام اور تعظیم و تکریم کا موجب گردانا جاتا تھا۔ یہ خانوادہ نسل در نسل سرفرازی و سر بلندی کا پرچم لہراتا رہا تھا۔ جہاں مولانا کے دادا حضرت حسین خطیبی عوام و خواص میں قدر و منزلت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، وہاں ان کے والد بہاء الدین ولد بھی علم و حکمت کی بلند ترین مسند پر جلوہ فرما تھے۔ آپ کے دائرہ تدریس میں ہزار ہا شاگرد شریک ہوا کرتے تھے۔ آپ کے وعظ کی مجلسوں میں عوام الناس کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا ایک سمندر در آتا تھا۔ نیز مختلف اطراف و جوانب سے جو یان حق کا قافلہ آپ کے در دولت پر حاضر ہوتا، متنوع مسائل دریافت کرتا، پیچیدہ فقہی امور کے متعلق رائے معلوم کرتا اور مذہبی معاملے میں آپ سے فتویٰ کا طلبگار ہوتا۔

اپنے والد کے ارد گرد صبح و مسابھانت بھانت کے لوگوں کو دیکھنا، ان کی باتیں سننا، پدر گرامی کے جوابات کی سماعت کرنا..... یہ سب وہ عوائل تھے جن سے کسمن رومی الگ تھلگ نہیں رہ سکتے تھے۔ پھر وہ شیخ بہاء الدین ولد کے اکلوتے فرزند تھے۔ وہ ان کی ادھیڑ عمری میں یعنی جب شیخ بہا ولد ساٹھ

سال کے تھے، پیدا ہوئے تھے اور یہ ایک فطری امر ہے کہ بڑھاپے کی اولاد ہر درجہ عزیز ہوتی ہے۔ چنانچہ شیخ ولد اپنے بیٹے جلال الدین کو سینے سے لگائے رکھتے اور خود سے جدا نہ کرتے۔ نومولود بچے کی صحیح تربیت اور اعلیٰ درجے کی تعلیم کے لئے وہ ہمیشہ کوشاں رہے۔

جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے، اس کا ذکر متعلقہ باب میں آئے گا، لیکن یہاں رومی کے عرصہ بلوغت میں تربیت سازی کی جانب والد بزرگوار کی بھرپور توجہ کا ذکر مقصود ہے۔ وہ دلی طور پر یہ تمنا رکھتے تھے کہ یہ اولاد زرینہ خاندانی عزت و وقار کا نمایاں نشان بنے اور باپ دادا کے ناموس، عزت، حرمت، علمی حیثیت اور دنیاوی وقار کا بھرپور انداز میں بھرم قائم رکھے۔

ان باتوں کی تکمیل کے لیے یہ ضروری امر تھا کہ نوعمر رومی کو والد اپنے ساتھ ساتھ رکھتے۔ واضح رہے کہ اگلے وقتوں میں بچے کی تربیت کا یہ ایک نہایت آزمودہ طریقہ تھا اور اس پر بیسویں صدی عیسوی کے اواخر تک عمل ہوتا رہا ہے¹۔

چنانچہ طلباء کو درس دینے کے لمحات ہوں، سائل کے سوالات کے جوابات دینے مقصود ہوں، وعظ کی مجالس منعقد ہوں، رومی ہر جگہ اپنے والد کے ”یک جان دو قالب“ کی صورت ساتھ ساتھ رہے اور اس طرح کچے ذہن کی نشوونما ہوتی رہتی۔ معصوم لوح دل پر دورِ طفلی کی باتیں منقش ہوتی چلی جاتیں۔

واضح رہے کہ جملہ منعقدہ مجلسیں شریعت ہی نہیں، طریقت کی علمبردار بھی تھیں۔ ان میں فقہی مسائل کے ساتھ سلوک و معرفت کی باتیں بھی بیان ہوتیں اور طریقت و تصوف کے اسرار و رموز بھی

1. سرسید احمد خاں نے تعلیم و تدریس کے میدان میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں، ان سے ایک دنیا واقف ہے۔ ایجوکیشنل کانفرنس اور علی گڑھ کالج سے کون آشنا نہیں ہے۔ یہی سرسید اپنے خاندان کے بچوں کو کہا کرتے تھے کہ شام کو گھر کے سامنے والے میدان میں ان کے روبرو کھلیا کریں تاکہ ان کی خامیوں پر کڑی نگاہ رکھی جاسکے اور صحیح معنوں میں ان کی تعلیم و تہذیب ہو سکے۔ یہ بھی یاد رہے کہ جب علامہ اقبال کے استاد میر حسن سیالکوٹ سے علی گڑھ گئے تھے اور سرسید کے مہمان بنے تھے تو آخر الذکر نے اپنے لڑکے محمود کو یہ حکم دیا تھا:

”بیٹا! سید صاحب کا کھانا ان کے کمرے میں خود لے جا کر پہنچا دو، وہ عبادت میں مصروفیت کی وجہ سے بڑے ہال میں ڈنر نہیں کھا سکیں گے۔ تم اپنے ہاتھ سے کھانے کی ٹرے ان کے پاس لے جاؤ اور ان کے سامنے مؤدب کھڑے رہنا، ہرگز نہ بیٹھنا اور وہ جو کچھ بولیں نہایت اٹہاک سے سننا۔“

اجاگر کئے جاتے۔ جلال الدین رومی پیدائشی طور پر ذہین و فطین تھے۔ وہ ابدالآباد تک کے لیے ایک نابغہ روزگار انسان بننے والے تھے۔ ان کا کلام بلاغت نظام پوری دنیا کو ششدر کرنے والا تھا۔ آریبری، نکلسن، براؤن، این میری شیمل اور علامہ شبلی نعمانی ان کی فکر کی تہہ بہ تہہ پرتوں کو الٹ پلٹ کر تجزیہ کرنے والے تھے۔ لہذا انہوں نے اپنے والد محترم کی صحبت میں بیٹھ کر بہت کچھ سیکھا، بہت کچھ معلوم کیا اور بچپن میں اس طرح ان کا پیکر تراشا گیا کہ ایک روز..... ”مناقب اللعارفین“ کے مصنف احمد افلاکی کے بقول:

”جلال الدین رومی جب چھ سال کی عمر کے تھے، ان کے بچپن کے ساتھیوں نے ایک روز یہ منصوبہ بنایا کہ پڑوس کی چھت پر چھلانگ لگائیں۔ رومی نے اپنے ہم جولیوں سے یہ کہا کہ دوستو! یہ ایک چھت سے دوسری چھت پر چھلانگیں لگانا تو بلیوں اور کتوں کا کام ہے۔ ہم کیوں نہ ایسا کریں کہ آسمان پر چھلانگ لگائیں اور مظاہر قدرت کا نظارہ کریں۔“

مذکورہ بالا روایت کو بار بار پڑھے اور یہ سوچئے کہ یہ کسی عمر رسیدہ شخص کی باتیں نہیں، ایک کسن، نوخیز اور چھ سالہ لڑکے کی گفتگو ہے۔ وہ سامنے کی چھتوں پر نہیں، بلند و بالا آسمان پر چھلانگ لگانا چاہتا ہے تاکہ مظاہر قدرت کا نظارہ کر سکے۔ یہ اولوالعزمی، ارادے کی یہ اڑان، آسمان پر چھلانگ لگانے کا یہ جذبہ بلند اور مظاہر قدرت کا نظارہ کرنے کی یہ آرزو..... اور وہ بھی چھ سال کے ایک بچے کی..... کیا اس حقیقت کا برملا اظہار نہیں کرتی کہ وقت کے جید عالم، دیار خراسان کے عظیم دینی رہنما اور خانوادہ خطیبی کے رکن رکیں شیخ بہاولد کی آغوش میں بلوغت کا زمانہ گزارنے والے یہ رومی نوجواں کس طرح تربیت کے مراحل سے گزر رہے تھے۔

واضح رہے کہ آسمان پر چھلانگ لگانے والا شخص نہ تو سائنس داں ہو سکتا ہے، نہ سپورٹس مین، نہ ہی مولوی نہ ملا، نہ عالم نہ فاضل!..... یہ جذبہ تو صرف اور صرف صوفی باصفا کا ہے، درویش خدامت کا ہے اور ولی اللہ کا ہے۔ اگرچہ کسن رومی اس وقت نہ تو صوفی باصفا بنے تھے، نہ ہی درویش خدامت قرار پائے تھے اور نہ ہی ولی اللہ کے درجے پر فائز ہوئے تھے..... لیکن یہ جذبہ بلند، یہ عزم و حوصلہ، یہ امنگ و آرزو اس بڑے باپ کی دین تھی جس کی آغوشِ پدری میں وہ اپنا زمانہ بلوغت گزار رہے تھے۔

یہ وہ والد گرامی تھے جن کی عظمت کا ڈنکا بلاد اسلامیہ میں بج رہا تھا۔ جن کی علمیت کا شہرہ چہار دانگ عالم میں تھا۔ جن سے اکتساب فیض کرنے والے سینکڑوں نہیں..... ہزاروں میں تھے۔ ایسی بلند مرتبت ہستی کے جلو میں بیٹھ کر جو بھی بچہ بلوغت کا زمانہ گزارے گا اور خاندان کا نہایت قیمتی علمی و تہذیبی ورثہ پائے گا، وہ مستقبل میں کیا کچھ بنے گا، اس کے بارے میں تو بس اتنا ہی کہا جاسکتا ہے:

ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات

یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ ذہین و فطین، زیرک و ہوشیار اور لائق و فائق بچے کے آثار ایام طفلی میں ہی ظاہر ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ دنیا کے عظیم المرتبت انسان بننے والے مولانا جلال الدین رومی کا عہد بلوغت حد درجہ تابناک و مزین تھا۔ ایک طرف ان کی جبلت اپنے اثرات دکھا رہی تھی، تو دوسری جانب علمی و ادبی ماحول میں ہونے والی پرورش و پرداخت ان کے جوہر خفتمہ کو ہمیز کر رہی تھی۔

اگر آپ دنیا کی عظیم شخصیات کی ابتدائی زندگی کا جائزہ لیں تو یہ دیکھیں گے کہ کوئی عہد طفلی میں یتیم و یسیر تھا، کوئی جہالت کی تاریکی میں نشوونما پا رہا تھا، کوئی غربت کی چکی میں پس رہا تھا، کوئی گندی نالیوں کے غلیظ کیڑوں کی طرح ریگ رہا تھا، کوئی دستِ معصوم دراز کئے ہر را بگیر سے بھیک حاصل کرنے کی تگ و دو میں مصروف تھا اور کوئی تنگ و تاریک گلیوں میں بدچلن و بدراہ افراد کے چنگل میں پھنس کر بدقماش کا غلیظ و نجس لبادہ اوڑھنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ یہ سب آدم کی اولاد تھے۔ سب ہی وقتِ پیدائش ایک جیسے تھے۔ لیکن حالات کے جبر نے ان کے اسپ حیات کی باگ مختلف سمتوں میں موڑ دی تھی۔

لیکن بلخ کے یہ نوخیز سپوت ایسے تمام مکروہات دنیوی سے محفوظ و مامون تھے۔ ان کے والد جید عالم دین تھے۔ وہ فی الواقع ایک عظیم باپ تھے جن کے ارد گرد مدرسین، طالب علم دین، سلاطین، امراء و مفکرین کا ایک مجمع لگا رہتا۔ پورے دیار اسلام میں ان کا طوطی بولتا تھا۔ پھر، مالی طور پر بھی اس گھرانے کو کسی پریشانی کا سامنا نہ تھا۔ چنانچہ کھانے کو اچھی چیزیں اور پہننے کو عمدہ لباس مہیا کر دیئے جاتے۔ خدمت کے لیے ملازمین ہمہ وقت موجود!

ذرا مولانا کے روم کے مستقبل پر نظر ڈالئے اور شمس تبریزی سے ملاقات سے پہلے کا دور

دیکھئے کہ وہ کس قدر شان و شوکت سے رہتے تھے۔ یہ دراصل زمانہ بلوغت کا حسین پرتو تھا جو وصل
مرشد تک کے لمحات پر منعکس رہا۔ اس شاندار دور بلوغت نے دراصل اس رومی کے قصر حیات کی
تعمیر و تشکیل کی جو آنے والے دنوں میں تمام عالم کے لئے مینارہ نور بننے والا تھا۔ اور یہ ہر کے نصیب
کی بات نہ تھی ع

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

دُعائے عطارؒ

سنہ بارہ سو بیس عیسوی حیاتِ رومی کے لیے جہاں سفر کی صعوبتوں کا ناقابل برداشت زمانہ تھا، وہاں ایک روحانی فیض سے متمتع ہونے اور ایک ذی وقار مصنف، شاعر اور درویش کی دعاؤں سے جیب و داماں کی تزئین کرنے کا درخشاں موقع بھی تھا۔

آٹھ سال پہلے جب مولانا نے روم کی عمر کل پانچ سال کی تھی، وہ اپنے والد کے ساتھ اس لیے بلخ چھوڑنے پر مجبور ہوئے تھے کہ بادشاہ وقت اور اسے ورغلانے والے لوگ شیخ بہاء الدین کے پاس عوام الناس کا اژدہام دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے تھے۔ ان لوگوں نے یہ نہ سمجھا کہ آنے والے ہزاروں افراد طالب علم و ادب ہیں، طالب جاہ و حشمت نہیں! چنانچہ خوارزم شاہ نے اپنے قلعے، خزانے اور محل کی چابیاں اس پیغام کے ساتھ شیخ بہاولد کی خدمت میں بھیج دیں:

”اسباب سلطنت سے صرف یہ کنجیاں رہ گئی ہیں، وہ بھی حاضر ہیں۔“

شیخ بہاء الدین ولد نے اسے اشارہ غیبی سمجھا اور بلخ سے ہجرت کر کے سمرقند آ گئے۔ ایک سال بعد واپس بلخ گئے اور وہاں تقریباً سات سال رہے۔ جب مغلوں کی یورش کی خبر موصول ہوئی تو دوبارہ بلخ چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور نیشاپور آ گئے۔ یہ مقام زمانہ قدیم سے علم و ادب اور تہذیب و تمدن کا گہوارہ رہا ہے۔ ظہور اسلام کے بعد اس خطے سے ابھر کر ایسی ایسی بلند مرتبت ہستیاں منظر عام پر آئیں

اور اپنے افعال و کردار کے وہ منور نقوش بساط عالم پر ثبت کر گئیں کہ زمانہ آج بھی ان کی فروزانی سے منور و تاباں نظر آتا ہے۔ جہاں عمر خیام جیسا نابغہ روزگار اور عظیم شاعر ابھرا، وہاں حضرت ابو بکر صیدلانی، شیخ ابوعلی، محمد بن عبدالوہاب ثقفی، شیخ ابو عثمان سعید سلام مغربی جیسے ثقہ بزرگ کے اسمائے گرامی خاصے نمایاں ہیں۔

ان ہی ذی مرتبت افراد میں شیخ فرید الدین عطارؒ تھے جو شاعر بھی تھے اور معلم بھی! جو سوانح نگار بھی تھے اور وقائع نگار بھی! جو صاحب شریعت بھی تھے اور صاحب طریقت بھی! جن کے قلم نے متعدد کتابیں لکھیں جو یگانہ روزگار بن گئیں۔ ”تذکرۃ الاولیاء“ نامی تصنیف خود ان کی بزرگانہ عظمت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے اور گزشتہ آٹھ سو سال سے دنیائے اسلام کے ہر مکین کے دل کو منور و تاباں کئے ہوئے ہے۔¹

اس حقیقت میں کوئی کلام نہیں کہ عطار ایک ولی کامل تھے، درویش بے ریا تھے، علم کا بحر بے کنار تھے، فکر و دانش کا ایک کوہ گراں تھے۔ یہ وہ بلند مرتبت شخصیت تھی جسے فارسی کے عظیم شاعر شیخ محمود شبستری نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف ”مثنوی گلشن راز“ میں اس طرح خراج تحسین پیش کیا تھا۔

مرا زیں شاعری خود عار ناید
کہ صد قرن یک عطار ناید

شاعر مشرق علامہ محمد اقبال کو شیخ فرید الدین عطارؒ سے حد درجہ عقیدت تھی۔ انہوں نے اپنے متعدد اشعار میں آپ کا ذکر کیا ہے۔ اس کی بین وجہ یہ تھی کہ اقبال کے مرشد روحانی مولانا جلال الدین رومی نے انہی شیخ نیشاپور سے کسب فیض کیا تھا۔

عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحر گاہی

1. راقم الحروف نے حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ کی اس ضخیم کتاب کو سلیس اردو میں تحریر کیا ہے جسے ”ذکر جمیل“ کے عنوان سے دوست پبلی کیشنز اسلام آباد نے شائع کر دیا ہے۔ ۷۵۶ صفحات پر مبنی اس کتاب میں ۹۶ بزرگان دین کے احوال و آثار درج ہیں۔

ذره کشت و آفتاب انبار کرد
 خرمن از صد رومی و عطار کرد
 مقام ذکر کمالات رومی و عطار
 مقام فکر، مقامات بوعلی سینا

شیخ فریدالدین عطار سے دلی عقیدت کا یہ اظہار محض مشرقی ممالک تک ہی محدود نہ تھا، یورپ کے دانشوروں نے بھی حضرت عطار کی علمی فضیلت کا اعتراف نہایت وسیع القلمی کے ساتھ کیا ہے۔ مثلاً مارگیرٹ اسمتھ یوں رقمطراز ہیں:

”عطار نے اپنی طویل ترین زندگی ادبی کاموں کی تکمیل میں صرف کر دی۔ انہوں نے نظم میں جو ضخیم ضخیم تصانیف قلمبند فرمائیں ان میں ”تذکرۃ الاولیاء“ واحد تصنیف ہے جو نثر میں لکھی گئی تھی۔ انہوں نے اپنی فکر انگیز نظموں کا دیوان بھی مرتب کیا تھا جو ہر لحاظ سے وسعت و اہمیت اور قدر و منزلت کا حامل ہے۔ اگرچہ حضرت عطار ایک شاعر کی حیثیت سے شہرت دوام سے بہرہ ور ہوئے لیکن اپنے فلسفیانہ خیالات اور صوفیانہ تصورات کے حوالے سے بھی خاصے مشہور و معروف ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ شیخ عطار کی جملہ تصانیف کا مرکز و محور ہی تصوف ہے..... اور تذکرۃ الاولیاء موصوف کا ایک ایسا شاہکار ہے جسے عطار نے کافی تحقیق و تلاش کے بعد صوفیوں کی زندگی اور ان کی گراں قدر تعلیمات کے متعلق مرتب کیا تھا۔“

دیار لندن کے مشہور منتشرق اور کیمبرج یونیورسٹی کے نامی گرامی پروفیسر اے جے آر بیر نے حضرت شیخ فریدالدین عطار سے اپنی دلی عقیدت کا اظہار اس طرح کیا کہ ان کی معرکتہ الآرا تصنیف ”تذکرۃ الاولیاء“ کا بہ زبان انگریزی نہایت فصیح و بلیغ ترجمہ کر ڈالا..... اور خود عطار کے مولد و مسکن نیشاپور کے مشہور فارسی شاعر کا تبی نیشاپوری نے اس عظیم شخصیت کے حضور جو خراج عقیدت پیش کیا ہے، وہ اپنی نظیر آپ ہے:

”میں بھی عطار ہی کی طرح گلشن نیشاپور سے تعلق رکھتا ہوں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں نیشاپور کا ایک کاٹا ہوں جبکہ حضرت عطار یہاں کے گلاب تھے۔“

اسی گلاب نیشاپور کی خوشبوئے جاں فزا سے فیضیاب ہونے کا موقع ہمارے تیرہ سالہ مدوح مولانا نے روم کو ملا، اور کچھ اس طرح: -

شیخ بہاء الدین ولد اپنے زمانے کے جید عالم اور ذی مرتبت بزرگ تھے۔ وہ بلخ سے جب روانہ ہوئے تو صرف کم عمر رومی اور گھر کے دیگر افراد ہی نہ تھے، مریدان خاص میں تین سو بزرگ ساتھ تھے۔ یہ قافلہ جس جس شہر سے گزرتا، وہاں کے عوام و خواص حضرت بہا ولد کی زیارت کو آتے اور دست بوسی کرتے۔ جب یہ قافلہ نیشاپور پہنچا تو اس کی آمد کی اطلاع پا کر رجل وقت حضرت شیخ فرید الدین عطار حاضر خدمت ہوئے۔

کس رومی اپنے والد کے جلو میں بیٹھے تھے۔ بقول علامہ شبلی نعمانی "سعادت کا ستارہ ان کی پیشانی سے چمکتا تھا۔" چنانچہ شیخ فرید الدین عطار نے اس طفل نوخیز کو اپنے سینے سے لگایا، پیشانی چومی اور شیخ بہاء الدین ولد کو مخاطب کر کے فرمایا:

"صاحبزادے کے جوہر قابل سے غفلت نہ برتے گا۔ اس بچے کو عزیز رکھے گا۔ یہ کسی دن تمام عالم میں پھیل ڈال دے گا۔"

ازاں بعد، رومی کو اپنی گراں قدر تصنیف "اسرار نامہ" پڑھنے کو دی۔ جب تک محفل میں موجود رہے، اس جوہر قابل کو اپنے قریب ہی بٹھائے رکھا اور گاہے گاہے اس کے سر پر دستِ شفقت پھیرتے رہے۔

شیخ فرید الدین عطار جس پائے کے بزرگ تھے، اس کا اندازہ قارئین کو سطور بالا کے مطالعہ سے بخوبی ہو گیا ہو گا۔ ایسا ذی مرتبت ولی جب کسی نو عمر بچے کی بابت کچھ کلمہ خیر کہہ دے، اس کی درخشاں پیشانی کا بوسہ لے، اس کے سر پر بار بار دستِ شفقت پھیرتے اور اسے مطالعہ کے لیے اپنی کتاب تحفہ کے طور پر دے تو یقیناً اس میں اسرار و رموز پنہان ہیں۔ اور اس کی وجہ بس اتنی ہے:

ولی را ولی می شناسد

مولانا نے روم کے والد بزرگوار اپنے پسر کی تربیت سازی کے لیے جو کچھ کر رہے تھے، اس کا مفصل ذکر گزشتہ باب میں آچکا ہے اور اب ایک ولی کامل اور صوفی باصفا کی گزارشِ خصوصی کو ملحوظ رکھتے

ہوئے زیادہ سے زیادہ توجہ اس ”جوہر قابل“ کی طرف مبذول کرنے لگے اور خود رومی نے شیخ فرید الدین عطارؒ کے پیکر میں جس مشفق و مہربان ہستی کو دیکھا تھا، جس کی گفتگو سنی تھی، اپنی پیشانی پر جس کے مقدس ہونٹوں کے لمس محسوس کیے تھے، اپنے سر پر جس کے دستِ شفقت کی لہریں موجزن دیکھی تھیں، جس کے تحفہ کتاب کو زندگی کی بیش بہا دولت متصور کی تھی اور جس کی دعائے اخلاص و بے ریا کو اثاثہ جاں سمجھا تھا..... اسے ہمیشہ اپنا رہبر کامل سمجھا۔ ”اسرار نامہ“ کی شکل میں جو ہدیہ نیشاپور کے اس درویش نے رومی کو دیا تھا، اسے وہ ہمیشہ سینے سے لگائے رہے اور اس کی رہنمائی میں زندگی کی منزلیں طے کرتے چلے گئے۔ صرف یہی نہیں، بلکہ اپنے آپ کو ”غلام شیخ عطار“ تک کہہ ڈالا۔

من آں ملائے رومی ام کہ از نطقم شکر ریزد
و لیکن در سخن گفتن غلام شیخ عطارم

حضرت عطار نے تیرہ سالہ رومی کو ”اسرار نامہ“ کی جو ایک جلد بطور ہدیہ پیش کی تھی، وہ گویا ایک فاضل معلم کی جانب سے ایک روحانی سبق تھا، اسرار و رموز کے غلاف میں لپیٹا ہوا اور کسن شاگرد نے اپنے آپ کو اس تحفہ بیش بہا کا پوری طرح اہل ثابت کیا۔ آگے چل کر جب اس بلخی سپوت نے دنیائے سخن میں قدم رکھا تو استاد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے نہ صرف تصوف کے موضوع کو بلکہ صنفِ مثنوی کو بطریق احسن پایہ تکمیل تک پہنچایا۔

حضرت عطار کا یہ عکس جمیل رومی کی ذات میں استاد کی جملہ تصانیف کے عمیق مطالعے کے بعد ہی نمایاں ہوا۔ نیز، عرفان و ادب میں شیخ فرید الدین عطارؒ جس بلند مقام پر فائز تھے، وہ ایک حقیقت ثابتہ ہے..... اور ہمارے ممدوح مولانا نے روم نے ان کا گہرا اثر قبول کیا۔ انہوں نے جہاں عطار نیشاپوری کے صوفیانہ افکار کی بھرپور پیروی کی ہے، وہاں مثنوی لکھنے کا سبک اور حکایتوں میں مطلب بیان کرنے کا ہنر بھی ان ہی سے سیکھا..... بلکہ بسا اوقات شیخ فرید کی عین عبارت ہی نقل کر دی۔

غرض، جس قد آور ہستی عطارؒ نے نوخیز رومی کو یہ دعادی تھی کہ کسی دن عالم میں ہلچل ڈال دے گا، وہی طفلِ ذہین و فطین جب 54 سال بعد شہرتِ دوام حاصل کرنے والی ”مثنوی معنوی“ لکھنے کا آغاز کرتا ہے تو اپنے اسی نیشاپوری استاد کی مثنوی ”منطق الطیر“ کو نمونہ بناتا ہے اور اسی طرز پر آغاز کار

کرتا ہے۔

بشنو از نئے چوں حکایت می کند
وز جدائیها شکایت می کند

اگرچہ مولانا نے روم میں سخن سنجی کی تحریک شمس تبریز کی ملاقات کی مرہونِ منت ہے اور اس میں تیزی و شدت آخر الذکر کے گم ہو جانے کے بعد ہی پیدا ہوئی، لیکن یہ بھی ناقابل تردید حقیقت ہے کہ رومی میں شعر و سخن کا جذبہ شیخ فرید الدین عطار کا ودیعت کردہ ہے۔ تیرہ سال کی عمر میں ”اسرار نامہ“ کا مطالعہ ہی ذوق شعری کی نشوونما کا باعث بنا۔ ازاں بعد، بقول علامہ شبلی نعمانی ”خواجہ عطار کی تصانیف مولانا کے لیے دلیلِ راہ بنیں۔“

اس طرح ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ حضرت عطار کی دُعا جہاں تشکیلِ رومی کا ذریعہ ٹھہری وہاں ان کی جملہ منظوم تصانیف، خصوصاً ”اسرار نامہ“ اور ”منطق الطیر“ سخن سنجی مولوی روم کی بنیاد بنی۔ اس طرح شیخ فرید عطار ایک وسیع النظر استاد کا درجہ رکھتے ہیں اور جلال الدین رومی ان کے ایک نیاز مند شاگرد نظر آتے ہیں جب ہی تو یہ بر ملا کہہ گئے ہیں۔

ہفت شہر عشق را عطار گشت
ما ہنوز اندر خم یک کوچہ ایم

تعلیم و تربیت

مولانا جلال الدین رومی کی یہ عین خوش قسمتی تھی کہ وہ بلخ کے ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جو علم و فضیلت اور دانش و حکمت کی وجہ سے پورے صوبہ خراسان میں عزت و تکریم کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ خود ان کے دادا بلند پایہ عالم و فاضل شخص تھے اور والد شیخ بہاء الدین ولد کا تو کہنا ہی کیا۔ وہ دینی علوم پر عبور حاصل کرنے کی بدولت اردگرد کے جملہ علاقوں میں ممتاز حیثیت کے حامل سمجھے جاتے تھے۔ درس وہ دیتے۔ وعظ وہ کہتے۔ تبلیغ وہ کرتے۔ فتویٰ وہ دیتے۔ کتابیں وہ تصنیف کرتے۔ شائقین علم و ادب سے عالمانہ گفتگو وہ کرتے۔ شریعت کے آداب وہ بتاتے۔ طریقت کے اسرار و رموز وہ بیان کرتے۔ غرض ایک عالم و فاضل اور حکیم و دانا سے جن امور کی توقع کی جاسکتی ہے، وہ سب کے سب بہاء الدین ولد بہ حسن و خوبی انجام دیتے رہے۔

ایسے ثقہ بزرگ اور صاحب علم شخص کی مجالس میں بیٹھنے والے افراد بھی زیور تعلیم سے آراستہ و پیراستہ ہوتے تھے۔ ان کی گفتگو عالمانہ و مفکرانہ ہوتی تھی۔ نئے نئے موضوعات پر بحث و تمحیص آئے روز کا منظر نامہ ہوتا تھا۔ پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کو سلجھانے کی کوششیں روز کا معمول ہوا کرتی تھیں۔

اور صاحب محفل شیخ بہاء الدین کا ذوق مطالعہ بھی خصوصی طور پر قابل ذکر ہے۔ تمام مصروفیات کے اختتام پر وہ اپنے گھر میں واقع دارالمطالعہ میں گھنٹوں بیٹھ کر کتب بینی میں مصروف رہتے۔ ان کے

لیے یہ کتابیں جو جملہ اسلامی ممالک سے منگوائی جاتی تھیں، ہر اہم موضوع پر لکھی ہوئی ہوتی تھیں۔ ان میں احادیث کے مستند مجموعے بھی تھے، فقہ کے موضوع پر متعدد تصانیف بھی تھیں، عربی و فارسی زبان و ادب کے متعلق لاتعداد کتب بھی تھیں۔

یہ خاندان بہاولد کا علمی و ادبی پس منظر تھا جس میں نوعمر رومی کے شعور نے انگڑائی لی۔ ہر طرف علم و ادب کا اُبلتا ہوا سوتا، ہر جانب پڑھے لکھے افراد کا ہجوم، ہر آن علمی و ادبی و مذہبی گفتگو کا سلسلہ، ہر لمحہ درس و تدریس کا مشغلہ!..... یہ سارے عناصر نفسیاتی طور پر نوحیز، ذہین و فطین رومی کی کشتِ حیات کی آبیاری کرتے اور ننھے منے فطری پودے کو سینچتے رہے۔ فطرت نے علم و ادب کا جو بیج ننھے ذہن میں بودیا تھا، اس کو پینپنے کا موقع خاندان کے علمی، ادبی، ذہنی، تہذیبی، سماجی ماحول نے بدرجہ اتم فراہم کر دیا۔

اور جب رسم مکتب نشینی انجام پائی تو رومی اپنے ہی خاندانی گھر میں والد کی نگرانی میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے بٹھادیے گئے۔ قرآن ناظرہ پڑھا۔ عربی و فارسی ادبیات کا مکمل کورس پڑھا۔ فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ احادیث کے مجموعے کو سبقاً سبقاً پڑھا۔ قرآن حکیم کا دقیق نظری سے مطالعہ کیا۔ حساب، منطق، طبیعیات، مابعد الطبیعیات، فلسفہ اخلاق اور دیگر مروجہ علوم کی درسیات کو لفظاً لفظاً پڑھا۔ یہ ساری تعلیم ایک ایسے شخص کی خصوصی نگرانی میں انجام پائی جو خود متعدد علوم کا بحرِ خار تھا۔ جس کے پائے کا عالم و فاضل پورے صوبہ خراسان میں اس وقت موجود نہ تھا۔ جو بلخ سے مستقلاً ہجرت کے ارادے سے نکلا تو ہر پڑاؤ پر وہاں کے اہل علم و بصیرت اس شخص کے تبحر علمی کو ملحوظ رکھتے ہوئے جوق در جوق آتے اور علم کے اس بحر بیکراں کی زیارت کرتے۔ واضح رہے کہ ان جو یانِ زیارت میں شیخ فرید الدین عطار جیسے بلند مرتبت مصنف و شاعر اور شیخ شہاب الدین سہروردی جیسے ثقہ بزرگ بھی شامل تھے۔ بلکہ آخر الذکر نے بقول مولانا جامی، بغداد پہنچنے پر شیخ بہاولد کا آگے بڑھ کر استقبال کیا تھا۔

اور اس بلخی عالم کے سامان سفر میں دنیاوی کرد و فر تو نہ تھا، البتہ کئی کئی اونٹوں پر کتابوں کے لدے ہوئے بورے اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ یہ مسافر کوئی ایسا دیسا باد یہ پیمانہ تھا، بلکہ علم و ادب، فکر و فن، تہذیب و تمدن کا ایک کوہِ گراں تھا..... اور کس جلال الدین اسی کے دامن میں تعلیم و تربیت پانے والے نوحیز چٹان!

والد کی نگرانی میں رومی متداول نصاب کے مطالعہ میں ہمہ وقت مصروف رہتے۔ والد بہاولد کو

یہ سب کچھ دیکھ کر یک گونہ اطمینان ہوتا۔ لیکن خود ان کی اپنی زندگی خاصی مصروف کار تھی اور ذمہ داریاں تھیں کہ ان میں ہر روز اضافہ ہی ہوتا چلا جاتا تھا۔ لہذا اپنے پسر کو ایک ایسے اتالیق کے سپرد کر دیا جس نے پوری تندہی اور خلوص کے ساتھ اس نوخیز پودے کو پروان چڑھایا۔

جلال الدین رومی کے یہ معلم برہان الدین محقق تھے۔ شہر ترمذ کے رہنے والے یہ ”بیرونی“ استاد شیخ بہاء الدین ولد کے نہایت ہی مقرب مرید تھے۔ نیز، علم و فضل میں یکتائے زمانہ تھے۔ مروجہ علوم و فنون پر ان کی نگاہ عمیق تھی۔ مطالعہ بے حد وسیع تھا۔ بحث و تحقیق میں دائرہ ادب سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ ان کی رائے جچی تلی اور صائب ہوا کرتی تھی۔ خود ان کے مرشد شیخ بہاؤ الدین کو ان کی علمیت پر کامل درجے کا اعتماد تھا۔

ظاہر ہے، اسی اعتماد کے نتیجے میں شیخ بہاء الدین ولد نے اپنے اُس ہونہار، ذہین اور لائق بیٹے اور آبروئے خاندان جلال الدین کو ان کے سپرد کر دیا تھا جس کی اعلیٰ درجے کی تعلیم کے لیے وہ شروع سے کوشاں تھے۔ اس سپردگی کے متعلق یوں کہیے کہ استاد کی تحویل میں دے دیا تھا۔ محقق نے بھی اس جذبہ حواگی کا پورا پورا پاس و لحاظ رکھا۔ ان کی ذہنی دسترس میں اور قلبی بساط پر جس قدر بھی مروجہ علوم تھے، ان سے رومی کو متمتع کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا۔ اور کرتے بھی کس طرح! یہ طفل ایک ایسی ہستی کا پسر تھا، جو محقق کے پیر بھی تھے اور ہادی و رہنما بھی! اس معلم رومی کے پاس جو کچھ بھی علمی اثاثہ تھا، وہ رومی کے باپ کا ہی عطا کردہ تھا۔ چنانچہ شیخ بہاؤ الدین کے اس ”حکم“ کو جہاں برہان الدین محقق نے اپنے لیے باعث اعزاز و افتخار سمجھا، وہاں ”پسر پیر“ کی اتالیقی و استادی کو دنیا و دین کی آبرو گردانا۔ ان ہی اسباب کی بنا پر معلم رومی نے اپنے شاگرد کو وہ سب کچھ دے دیا، جو عموماً اعلیٰ درجے کا استاد کم ہی عطا کرتا ہے اور یہاں معاملہ تھا:

الامر فوق الادب!

ہم بلا خوفِ تردید کہہ سکتے ہیں کہ مولانا رومی کی تعلیم و تربیت جس انداز میں انجام پائی، وہ کم ہی کسی نابغہ روزگار کے مقدر کو نصیب ہوا ہے۔ یہ بھی از من الغیب ایک عطیہ تھا۔ اور ذہین و فطین رومی نے اس کو بخوبی محسوس بھی کیا اور اس سے مستفیض ہونے کی بھرپور جدوجہد بھی کی۔ بقول علامہ شبلی نعمانی

”مولانا نے اکثر علوم و فنون انہی سے حاصل کیے۔“

رومی کو اپنے استاد اودا تالیق محقق ترمذی سے جو فیض حاصل ہوا اور ان کے ذہن و دل کی جس طرح جلا ہوئی، اس کے وہ ہمیشہ معترف رہے اور اسی عقیدت کے نتیجے میں وہ نہ صرف محقق کے گن گاتے رہے ہیں بلکہ اپنے بیٹے بہا ولد کو بھی ان ہی ترمذی استاد کی شاگردی میں دے ڈالا۔

مولانا رومی حصول تعلیم کے مراحل طے کرتے ہوئے اپنے والد شیخ بہاء الدین ولد کے ہمراہ بلخ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکلے تو قونیہ تک کے طویل سفر کے دوران وہ نیشاپور، بغداد، شام، مکہ، زنجان اور لارندہ میں بھی ٹھہرے۔ کہیں شیخ فرید الدین عطار سے ملاقات ہوئی، کہیں شیخ شہاب الدین سہروردی کی محفل میں بیٹھنا نصیب ہوا اور کہیں فخر الدین بہرام شاہ سے شناسائی حاصل ہوئی۔ اس طولانی سفر میں یقیناً اور بھی دانا و بینا حضرات رومی کو ملے ہوں گے، مگر مذکورہ تین شخصیات سے ملاقات کا تاثر ایسا نہ تھا کہ کالعدم قرار پاتا۔ شیخ عطار سے بہرہ یاب ہونے کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ شیخ شہاب بھی عطار ہی کی طرح جلیل القدر صوفی اور سلسلہ سہروردیہ کے رکن رکین تھے۔ تیسری شخصیت بہرام شاہ کی تھی جو خود بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ حکمران تھا اور اسی فطری خوبی کے نتیجے میں اہل علم و ادب کی قدر افزائی کرتا تھا۔ یہ وہ شخص ہے جس کی قدر و منزلت نظام گنجوی کے دل میں بدرجہ اتم موجود تھی اور اسی جذبے کے تحت انہوں نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف بہ عنوان ”مخزن الاسرار“ اس علم دوست بادشاہ کے نام معنون کی تھی۔

ہم اس مقام پر ایک لمحے کے لئے ٹھہر کر یہ سوچیں کہ کیا ان تینوں قد آور شخصیات سے ملاقات، مولانا نے روم کے لیے محض سرسری شناسائی ثابت ہوئی ہوگی یا کچھ اور بھی! ماہرین تعلیم کا یہ مسلسل اصرار رہا ہے کہ کسی ذہن و فطین بچے کے لیے محض کتاب، اتالیق اور استاد کا عنصر ثلاثہ ہی کام نہیں کرتا، دیگر بیرونی عوامل بھی اپنا موثر کردار ادا کرتے ہیں۔ ان میں کالمین فن کی گفتگو، بحث و تمحیص کا انداز، واعظ کی گرمی محفل، تہذیب و ادب پر مبنی ماحول، ملاقات کا منظر نامہ، ارد گرد کی فضا کا غائر تجزیہ، مختلف شہر اور وہاں کے عوام کا معیار زندگی..... غرض طریقہ تدریس کے علاوہ بھی یہ اقدار ایک لائق و فائق بچے کی ذہنی، علمی اور ابلاغی نشوونما میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ چنانچہ ہم بلا تردد یہ کہہ سکتے ہیں کہ رومی کی تعلیم و تربیت میں طول طویل سفر کے دوران پیش آنے والے یہ جملہ عوامل اپنا اپنا حصہ ادا کرتے

رہے ہیں..... یوں کہہ لیجیے کہ شیخ بہاء الدین ولد اور ان کے مرید خاص بدرالدین محقق جہاں تعلیم و تدریس کے بلا واسطہ محرک و موجب تھے، وہاں بلخ سے قونیہ تک کے طویل سفر کے مذکورہ بالا عوامل بھی بالواسطہ تعلیم و تربیت رومی کا مؤثر ذریعہ قرار پائے تھے..... اور تعلیمی نفسیات اور اثر و قبول کا فلسفہ ہمیں یہی سب کچھ باور کراتا ہے۔ چنانچہ نابغہ روزگار رومی کی تعلیمی قدر و قیمت کا تجزیہ کرنے کے دوران ہمیں دس سالہ سفر اور اس کے اثرات سے صرف نظر نہیں کرنا چاہیے۔

قونیہ میں شیخ بہاء الدین ولد جب وفات پا گئے تو رومی ان کے مسند نشین ٹھہرے۔ اب چوبیس سالہ جلال الدین رومی کے کاندھے پر بہت بڑی ذمہ داری آ پڑی تھی، اس لیے کہ خالی کی ہوئی یہ جگہ ایسے شخص کی تھی جو دیار اسلام میں ”سلطان العلماء“ کے لقب سے سرفراز ہو چکا تھا..... اور رومی نہ صرف ایسے بلند مرتبت باپ کے بیٹے تھے بلکہ سلطان العلماء کے جانشین بھی! چنانچہ خود کو اس مقام و مرتبے کا پوری طرح اہل ثابت کرنے کے لیے مزید تعلیم کا حصول ان کے لیے ضروری تھا..... اور اس مقصد کی خاطر:

اِطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ كَان فِي الصَّيْنِ

جیسی مستند حدیث پہ عمل پیرا ہونا لازمی تھا۔

مولانا نے روم کے زمانے میں حلب اور دمشق علوم و فنون کے نہایت اہم مراکز تصور کیے جاتے تھے۔ لہذا مولانا جلال الدین رومی قونیہ سے حلب کے لیے عازم سفر ہوئے اور وہاں کے مشہور عالم مدرسہ حلاویہ میں داخل ہوئے۔ اس وقت حلب کے اس دانش گاہ کے مدرس اعلیٰ کمال الدین بن عدیم حلبی تھے۔ وہ جامع صفات کے حامل انسان تھے، یعنی محدث بھی تھے، مورخ بھی! فقیہ بھی تھے اور ادیب بھی! مفتی بھی تھے اور کاتب بھی! شاعر بھی تھے اور صوفی بھی! موصوف نے حلب کی جامع تاریخ بھی لکھی تھی۔ غرض مولانا رومی نے کمال الدین حلبی کے پیکر میں ایک ایسے استاد کو دیکھا جو ان کی تشنگی علم کو بجھا سکتا تھا۔ دوسری طرف حلبی نے بھی اس نووارد شاگرد کے روپ میں حد درجہ ذہین و فطین طالب علم کا پیکر دیکھا۔ چنانچہ اس دو طرفہ تاثر نے رومی کو سراپائے حلبی سے مستفیض ہونے کا نادر موقع عطا کیا۔ غرض، والد مرحوم اور بدرالدین محقق کے بعد اپنے اس تیسرے استاد سے جلال الدین رومی نے مضامین مذہبیات میں مکمل درس لیا اور جملہ فقہی مسائل پر عبور حاصل کیا۔

ازاں بعد، مولانا رومی دمشق چلے گئے اور وہاں کے مشہور مدرسہ برانیہ میں داخل ہوئے۔ وہیں ایک حجرے میں رہتے اور تحصیل علم میں ہمہ تن مصروف و سرگرداں دیکھے جاتے۔ اس طرح کابل سات سال کا عرصہ دمشق میں گزار کر قونیہ واپس آئے۔ اس وقت حالت یہ تھی کہ بقول علامہ شبلی نعمانی ”مولانا نے تمام علوم درسیہ میں نہایت اعلیٰ درجے کی مہارت پیدا کر لی تھی۔“ آٹھ سالہ قیام حلب و دمشق کے دوران ان کو دنیائے علم و دانش میں جو مقام حاصل ہو گیا تھا، اس کا اندازہ ”جواہر مضمیہ“ کے مصنف کی اس روایت سے بخوبی ہو جاتا ہے:

”كَانَ عَالِمًا بِالْمَذَاهِبِ، وَاسِعَ الْفِقْهِ، عَالِمًا بِالْخِلَافِ وَ
انواع العلوم۔“

غرض، ظاہری علوم کے حصول کا جو سلسلہ شیخ بہاء الدین ولد، بدر الدین محقق ترمذی اور کمال الدین حلبی جیسی مخزن علوم ہستیوں سے شروع ہوا تھا وہ دمشق کے مدرسہ برانیہ پر اختتام پذیر ہوا اور مولانا جلال الدین رومی خود کو اپنے والد کے لقب ”سلطان العلماء“ کے شایان شان بنانے کے پوری طرح اہل ہو گئے تھے۔

درس و تدریس

جیسا کہ گزشتہ ابواب میں ہم دیکھ آئے ہیں کہ مولانا جلال الدین رومی ایک ایسے خانوادے کے فرزند جلیل تھے جہاں علم کا دریا رواں تھا۔ جہاں عوام اور خواص دونوں کی اصلاح فریضہ اول سمجھی جاتی تھی۔ جہاں طلبا کی درس و تدریس کو لازمہ زندگی قرار دیا جاتا تھا۔ گویا پڑھنا اور پڑھانا، سمجھنا اور سمجھانا اور عمل کرنا اور کروانا یہی اس خاندانِ خطیبی کا مطمح نظر اور مقصد حیات تھا۔

مولانا نے روم نے اپنی ذہانت بھری آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھا تھا۔ اور ان عوامل و عناصر کو حرز جاں بھی بنا لیا تھا۔ چنانچہ وہ نہایت تندہی سے حصول تعلیم میں مشغول رہے تا آنکہ چوبیس سال کی عمر میں اپنے والد شمس العلماء شیخ بہاء الدین ولد کے جانشین قرار دیئے گئے۔ اب ان کی زندگی کا مشن وہی تھا جو والد گرامی سرانجام دیتے رہے تھے، یعنی درس و تدریس!

مگر ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا نے روم میں قدرت نے یہ ملکہ تدریسی تو عین طالب علمی کے زمانے میں پیدا کر دیا تھا۔ جیسا کہ علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

”طالب علمی ہی کے زمانے میں عربیت، فقہ، حدیث، تفسیر اور معقول میں یہ کمال حاصل کیا کہ

جب کوئی مشکل مسئلہ پیش آتا اور کسی سے حل نہ ہوتا تو لوگ ان کی طرف رجوع کرتے۔“

بادرکبھی کہ جو شخص اپنی طالب علمی کے زمانے میں ہی اس صلاحیت کا حامل ہو کہ فضلا و حکماء

کے لاینچل مسئلے کو آن واحد میں حل کر کے لوگوں کو مطمئن کر دے..... وہ یقیناً درس و تدریس کی اعلیٰ مسند پر متمکن ہونے کا اہل تھا اور رومی نے بلاشک و شبہ یہ تقاضائے معلّٰی پورا کر دکھایا۔

مولانا نے روم نے مذہبی تعلیم نہایت اعلیٰ درجے کی حاصل کی تھی۔ ان کی تربیت بھی بہت عمدہ طور پر ہوئی تھی۔ والد موصوف کی وفات کے بعد جو رہی سہی کسر تھی، وہ نہ صرف حلب اور دمشق کی درسگاہوں میں پوری ہوئی بلکہ ان کے سابق اتالیق اور استاد برہان الدین محقق نے تونیا آ کر اسے مزید مکمل کر دی تھی اور بدیع الزماں فروزاں کے بقول موصوف جلال الدین سے یہ کہا تھا:

”تم نے معقولی، رسمی، روحانی اور اکتسابی علم تو بدرجہ احسن حاصل کر لیا تھا، اب میری نگرانی میں باطنی علم سے بھی بخوبی آشنا ہو چکے ہو۔ لہذا اب اپنے پدر بزرگوار کے جانشین کی حیثیت سے گمراہ انسانوں کی رہنمائی اور مذہب سے لاعلم مسلمانوں کی دینی تعلیم کی تدریس کا سلسلہ جاری کر دو۔“¹

گزشتہ ابواب کے دوران مطالعہ ہم یہ بھی معلوم کر چکے ہیں کہ مولانا نے روم کے والد شیخ بہاء الدین بلخ سے ہجرت دائمی کرنے کے بعد، مختلف مقامات کا دورہ کرتے ہوئے جب بغداد تشریف لائے تو وہاں طویل عرصہ مقیم رہے۔ اس قیام میں وہ اپنے نصب العین سے سرمو غافل نہیں رہے..... یعنی درس و تدریس! آپ کی اس مجلس علمی میں ہر فرد بشر شریک ہو کر اپنی دینی معلومات کو وسعت دیتا اور قلب و ذہن پر پڑے ہوئے دبیز جالے کو صاف کر کے اسے مجلّی کرتا۔

شہر بغداد میں دیئے جانے والے درس کا سلسلہ مقامی طور پر ہی مشتمل نہیں ہوا تھا، دور دراز کے علاقوں تک اس کی خبر پھیل چکی تھی۔ چنانچہ شیخ بہا ولد کے عالمانہ وعظ اور اثر انگیز پند و نصیحت سے مستفیض و بہرہ ور ہونے کے لیے لوگ جوق در جوق وہاں پہنچتے اور خطیب دوراں کی خطابت سے شاد کام ہوتے۔ اسے حسن اتفاق کہیے کہ انہی دنوں سلطنت روم کے فرماں روا، سلجوقی سلطان علاء الدین کیقباد کے سفارت کار یہاں آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے شہرہ خطابت اور آوازہ تدریس بہا ولد سن کر مذکورہ مجلس میں شرکت کی اور متاثر ہوئے۔ وطن واپسی پر اپنے فرما روا کیقباد کو وعظ و پند اور درس و تدریس کے

1 جب شیخ بہاء الدین ولد کی وفات واقع ہوئی تھی، مولانا کے استاد برہان الدین محقق تونیا میں موجود نہ تھے۔ وہ ایک سال بعد آئے اور اپنے شاگرد کی بقیہ تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔ انہیں 120 دنوں کی ریاضت سرانجام دینے کا حکم دیا تھا۔ اس باطنی تین چلہ کشی میں کامیاب قرار دینے کے بعد شاگرد کو مذکورہ بالا حکم دیا تھا۔

اس سلسلہ روحانی سے مطلع کیا۔ یہ سن کر شاہ مذکور نے شیخ بہاء الدین کو اپنی سلطنت میں قدم رنجہ فرمانے اور دار الخلافہ ملک، یعنی قونیہ میں مستقلاً قیام کرنے کی دعوت دی۔ چنانچہ آپ اگلے تمام سفر کے اختتام پر قونیہ تشریف لائے۔ یہ سنہ 1229ء کی بات ہے اور تاریخ تھی 3 مئی کی۔ مولانا نے روم اکیس بائیس سال کے جوان رعنا کی حیثیت میں والد کے پاہر رکاب تھے۔

سلطنت سلجوقی کے عظیم الشان دار الخلافہ قونیہ میں اس خانوادہ بلخ کا شاندار استقبال کیا گیا۔ سلطان کیقباد نے اپنے معزز و محترم مہمان شیخ بہاء الدین ولد کے لیے جہاں دنیاوی ساز و سامان فراہم کیے وہاں اعلیٰ درجے کا ایک مدرسہ بھی تعمیر کرایا تاکہ آپ طلبا کو فقہ اور دیگر علوم دیدیہ کی تعلیم دے سکیں۔ مولانا نے روم بھی اس مدرسے میں والد گرامی کے سامنے زانوئے تلمذتہہ کرتے رہے اور دینی علوم کے بحرِ خار سے اپنی تشنگی بجھاتے رہے۔ واضح رہے کہ ان کے اتالیق بدرالدین محقق وہاں موجود نہ تھے اور شیخ بہاؤ الدین اکیس سالہ جلال کو بے دست و پا نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ گویا مدرسہ قونیہ میں والد بزرگوار کے زیر سرپرستی ان کا یہ تعلیمی سلسلہ دو سال جاری رہا۔

اور جب 1231ء میں بلخ کے نامور عالم حضرت بہاؤ الدین انتقال فرما گئے تو ان کے صاحبزادے جلال الدین رومی مولانا نے محترم بن کر ان کی مسند پر متمکن ہوئے اور درس و تدریس کے پیشے میں منہمک ہو گئے۔ چونکہ وہ پیدائشی طور پر ذہین و فطین واقع ہوئے تھے اور فنِ خطابت کا خاندانی ورثہ پایا تھا، لہذا بہ حیثیت مدرس نام کما تے گئے۔ تاہم ”شمس العلماء“ کی مسند پر بیٹھنے کے بعد اس کا بدرجہ کمال اہل ہونا ضروری سمجھتے تھے۔ اسی خیال کے پیش نظر عازمِ حلب و دمشق ہوئے اور وہاں سے کندن بن کر لوٹے۔ پھر، وہ تھے، مدرسہ تھا، طلبا تھے اور سلسلہ ہائے تدریس!

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مولانا جلال الدین رومی خاص پیشہ ہائے درس و تدریس کے لیے ہی پیدا کیے گئے تھے۔ ان کا اندازِ خطابت، ان کا طرزِ استدلال، ان کی نکتہ آفرینی، ان کا طریقہ ہائے تدریس، ان کا اثر انگیز مکالمہ، طلبا کا جائزہ لینے والی ان کی نگاہ عمیق!..... یہ وہ صفتیں تھیں جنہوں نے مولانا رومی کو اپنے وقت کا ایک اعلیٰ مدرس، ایک تجربہ کار معلم اور ایک نبض شناس رہنما بنا دیا تھا۔ وہ ہر طبقے میں مقبول تھے۔ سلجوقی سلطان کا دربار ہو، عوام کی محفل ہو، خواص کی بزم ہو، طلبا کی اقامت گاہ ہو..... ایک معلم بے بدل اور مدرس بے مثال کے طور پر ان کا تذکرہ جاری رہتا۔ گویا سلطنتِ کیقباد

میں مولانا جلال الدین رومی کا ڈنکانج رہا تھا۔

اور جہاں تک ان کی علمیت، فصاحت اور بلاغت کا تعلق تھا، کوئی شخص بھی تو نیہ تو نیہ... کسی بھی جگہ ان کا مد مقابل نہ تھا۔ وہ اپنی علمی دسترس، فطری انج، صاف گوئی، دینی استقامت اور مذہبیات میں کامل عبور رکھنے کی وجہ سے ایک ایسا مقام حاصل کر چکے تھے جو حقیقتاً دنیائے اسلام کے لیے باعث اعزاز تھا۔ ان کی ہر رائے صائب سمجھی جاتی تھی، ان کا ہر قول قول فیصل تصور کیا جاتا تھا، ان کا پڑھایا ہوا سبق، سبق آخر تھا، ان کی ہر گفتگو اٹل اور ان کا ہر بیان پتھر کی لکیر کے مترادف تھا۔ وہ تو نیہ کے قاضی تھے اور لامثال!..... وہ سلطنت کی قباد کے مفتی تھے اور بے نظیر! وہ مدرسے کے مدرس تھے اور لا جواب!

یہاں یہ حقیقت واضح کر دی جائے کہ جب شیخ بہاء الدین ولد بلخ سے ہجرت کر کے نیشاپور آئے اور ان کا سفر تو نیہ پر اختتام پذیر ہوا تو ان کے ہمراہ صرف اہل خاندان ہی نہ تھے، ہزاروں شاگرد اور عقیدت مند بھی تھے۔ یہ سب ان کے جاں نثار تھے۔ عقیدت مند اور حلقہ بگوش تھے۔ یہ تمام افراد بہاولد کے انتقال کے بعد ان کے فرزند ارجمند مولانا جلال الدین رومی کے پروانے بن گئے۔ ان تمام افراد نے آپ کی ذات میں مخلص مدرس، ہمدرد استاد اور بے ریا رہنما کی جھلک دیکھی۔ پھر، اس علاقے کے رہنے والے اور اردگرد کی بستیوں کے مکین جو جو درجہ مولانا کے حلقہ بگوش ہوتے گئے۔ ان لوگوں میں جہاں عام سطح کے لوگ تھے وہاں دانشوران عصر بھی تھے، علمائے زمانہ بھی تھے اور فضلاء دوراں بھی تھے۔

جملہ افراد مولانا نے روم کے حلقہ بگوش بن کر ان کی تدریس سے متمتع ہوتے، ان کی گوہر افشانی سے جیب و داماں کی تزئین کرتے اور ان کی حکمت آمیز گفتگو سے ذہن و دل کو اجال دیتے۔ ہزاروں ہزار شاگردوں کا مجمع ہمہ وقت مولانا نے روم کے ساتھ رہتا۔ اس لئے کہ وہ چلتی پھرتی قاموس تھے۔ راہ میں اقوال کے موتی بکھیرتے جاتے اور طلباء و عقیدت کیش حضرات انہیں اپنے دامن میں سمیٹتے چلے جاتے۔

ایسا مقبول و معتبر استاد تاریخ کے کسی دور میں اجاگر نہیں ہوا تھا جس کے بارے میں یہ کہا جا

سکے ع

چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

لیکن یہاں ایک ایسا بطل جلیل تھا جو صوبہ خراسان کے تاریخی شہر بلخ سے اکیلا ہی چلا تھا.....

اور قونیہ پہنچنے کے بعد یہ صورت سامنے آئی۔

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

طالب علموں، دانشوروں، تشنگانِ حق و صداقت اور طالبانِ حکمت و فن کا ایک عظیم الشان
کارواں تشکیل دینے والے مولانا جلال الدین رومی کا یہ منظر شاہانہ بھی عالم روزگار نے دیکھا کہ آپ
نہایت کروفر کے ساتھ فرشِ مزین پر متمکن ہیں۔ طلبا مودب بیٹھے ہیں۔ جو یانِ حکمت و دانش سرا پا ادب
بنے تشریف فرما ہیں۔ پاس ہی حوض میں نصب شدہ فوارہ سے پانی کا ترشح گلرنگ سماں پیدا کر رہا ہے۔
مولانا نے روم نہایت ہی پر وقار انداز میں علم و حکمت کے موتی لٹا رہے ہیں..... کہ معا بوسیدہ سی کالی کالی
لپیٹے ایک مجذوب وہاں در آتا ہے۔ اور پھر.....

پوری طرح ملی بھی نظر سے نظر نہیں
عالم یہ ہو گیا کہ کچھ اپنی خبر نہیں

مولانا نے روم دنیائے علم و حکمت سے بالکل بے خبر ہو گئے۔ سلسلہ تدریس منقطع ہو گیا۔
اصلاح و تربیت کے تار و پود بکھر کر رہ گئے..... اور یہ آنے والا کون تھا؟..... اگلا صفحہ الٹ کر معلوم کر
لیجیے۔

قرب تبریزی

وہ 1244ء کا زمانہ تھا۔ شہر تبریز میں ایک ایسے بلند پایہ بزرگ تھے جنہیں مورخین نے ملائیت، کینہ توزی اور تعصب کی آنکھوں سے دیکھا۔ جنہیں یہ رجل غیب ہمیشہ ایک معمرہ نظر آئے..... اس لیے کہ ایسے تمام مورخین، ناقدین، مفسرین کلام رومی اور سوانح نگاران مولانا نے مذکورہ شخصیت کو علوم ظاہری کے پیمانے سے ناپا، بندھے ٹکے اصول سے جانچا اور اپنے ہی تراشیدہ قانون کے دائرے میں کھڑا کر کے اس کی تکابوٹی کرنے کی کوشش کی..... محض اس لیے کہ آں بزرگ نے مولانا جلال الدین رومی کو مسند مفتی اعظم سے اٹھا دیا تھا۔ جنہوں نے مدرسہ قونیہ کے احاطے سے اس ثقہ عالم وقت کو نکال کر طبلہ بجانے، موسیقی سننے اور ناچنے گانے پر آمادہ کر دیا تھا۔ لیکن اسرار و رموز الہی سے یہ تمام مورخین، ناقدین، شارحین اور سوانحی کاتبین سر مو واقف نہ تھے۔ انہیں وسعت ذوق نظر نصیب نہ تھی اور ”حسن دوست“ کی پہنائیوں سے وہ سراسر ناواقف تھے۔ بقول شاعر۔

عالم تمام آئینہ حسن دوست ہے
لیکن نصیب وسعت ذوق نظر نہیں

سارے زمانے کے معتب یہ وہ شخص تھے جنہوں نے تقریباً آٹھ سو سال قبل آنحضرت ﷺ کی

شان میں اس طرح مدح سرائی کی تھی:

”اے اللہ کے رسول! آپ اللہ رب العزت کے محبوب ہیں۔ خداوند تعالیٰ نے آپ کو حد درجہ عزت و احترام عطا فرمایا ہے۔ آپ ہی اس کائنات کے محور ہیں۔ آپ تمام پیغمبروں اور اولیاء اللہ کے محبوب نظر ہیں۔ یہ شمس تبریزی کس طرح آپ کی تعریف بیان کرنے کے لائق ہو سکے گا۔ آپ بلاریب مصطفیٰ ہیں، مجتبیٰ ہیں اور سارے ہی عظیم انسانوں سے عظیم تر ہیں۔“ (ترجمہ)

یہی وہ بزرگ تھے جنہوں نے رقیق القلسی، آہ نیم شمش اور آنسوؤں کی لڑی کے جلو میں خداوند قدوس کے حضور یہ دعا مانگی تھی:

”اے پروردگار عالم! میں عرصہ دراز سے تیری عبادت کر رہا ہوں۔ تو نے مجھے عرفان و حکمت کی دولت عطا فرمائی ہے۔ تو نے مجھے مسند ولایت پر بٹھایا ہے۔ اب کمی ہے تو اس بات کی کہ میں کسی ایسے انسان سے ملاقات کروں جو رضائے الہی میں سب سے زیادہ مقرب ہوتا کہ اس کی خدمت میں حاضر ہو کر تیرے عطا کردہ علم و عرفان کی دولت میں سے اسے بھی کچھ دوں، اسے بھی عشق حقیقی کے اسرار و رموز سے آگاہ کروں اور اپنی ولایت کی مسند پر اسے بٹھاؤں۔“

شہر تبریز کی ساٹھ سالہ بزرگ شخصیت کی مذکورہ دعا مستجاب ہوئی اور غیب سے ندا آئی:

”اے بندے! تیری دعاء ہم نے قبول فرمائی۔ تیری خواہش کے بموجب ایسا شخص تبریز میں نہیں ملے گا۔ اس کے لئے تجھے اپنا وطن چھوڑنا ہوگا، طویل مسافت طے کرنی ہوگی۔ اگر تو مسافرت کی تکالیف برداشت کرنے کی ہمت رکھتا ہے تو روم کے شہر قونیہ کے لیے روانہ ہو جا۔ وہاں تجھے جلال الدین رومی ملے گا۔ وہ شخص اپنے وقت کا مفتی، عالم و فاضل اور برگزیدہ بندہ ہے۔ اسی کی قربت میں تیری آرزو پوری ہوگی۔ وہی تیری ولایت کا جانشین اور علم و عرفان کا مستحق ہوگا۔“

جس ہستی کی بابت غیبی اشارہ کیا گیا، وہ محض 36 سال کا جوان رعنا تھا..... اور مستجاب دعا سے سرفراز ہونے والے شخص زندگی کی ساٹھ بہاریں دیکھ چکے تھے۔ تقریباً نصف عمر کا یہ تفاوت اس مقولے کی صحیح تصویر ہے:

بزرگی بہ عقل است نہ بہ سال

جس باشندہ تبریز کو قبولیت مناجات کے زیر اثر روم جانے اور مولانا جلال الدین رومی سے ملنے کی ہدایت کی گئی تھی، ان کا نام نامی ہے شمس الدین تبریزی! اگرچہ ابتدائے عمر میں وہ کسی اور ہی فرقے سے وابستہ تھے لیکن ازاں بعد اس مسلک کو ترک کر کے ایک خدا رسیدہ بزرگ بابا کمال جندی کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گئے اور ان کی نگرانی میں طریقت و معرفت اور سلوک و عرفان کی تمام منزلیں طے کر لیں۔

شمس تبریز ابتدائے عمر سے ہی فقر و درویشی کی زندگی کے خوگر تھے۔ آپ کا یہ معمول تھا کہ چالیس روز تک فاقہ کرتے اور اس دوران مسلسل عبادت و ریاضت میں مشغول رہتے تھے۔ آپ ہمیشہ گوشہ نشینی کی زندگی گزارتے اور عوام الناس سے کترایا کرتے۔ گویا خفا آپ کا وطیرہ تھا۔ اور اسی پردہ خفا میں رہ کر سخت ترین عبادت و ریاضت کرنا پسند کرتے تھے۔

یہ بات مشاہدے میں آئی ہے کہ عوام الناس ایسے عبادت گزار اور خلوت نشین بزرگوں کی تاک میں رہتے ہیں اور ان کے پاس کسی نہ کسی غرض سے پہنچ ہی جاتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ عموماً دعا و تعویذ کے خوگر ہوتے ہیں اور جھاڑ پھونک کو مقصد حیات سمجھتے ہیں۔ مگر شمس تبریز کا مسلک ہی جدا تھا۔ وہ فنا فی العشق الہی تھے اور اس سے سرمو تجاوز کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ یہ حقیقت بھی ہے کہ سلوک و معرفت کے راہی اپنے جملہ اوقات یاد الہی میں بسر کرنے کے متمنی ہوتے ہیں نہ کہ مجمع لگانے اور کاروبار چکانے کے!

جب اہل تبریز نے آپ کو اس طرح غرق عبادت دیکھا اور ولئی کامل کے مقام پر متمکن پایا تو لگے ان کے گرد پھیرا لگانے۔ دنیاوی آرزوؤں کے حصول کی خاطر ان کے اوقات عبادت میں مسلسل مخل ہوتے۔ شمس تبریز کے منع کرنے کے باوجود آنے والوں کا اثر دہام کم نہ ہوا۔ چنانچہ آپ نے مجبور ہو کر ایسے لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا شروع کیا جو سراسر کاروباری تھے اور دنیا کے طمع میں شب و روز مصروف رہتے۔ یہ بہرہ و حد درجہ کارگر ثابت ہوا۔ لوگوں نے انہیں بھی لین دین میں ملوث پایا تو ان کی طرف سے متنفر ہوتے گئے اور یوں مجمع چھٹ گیا۔ وہ تہارہ گئے..... اور شمس تبریزی یہی چاہتے تھے۔ گوشہ کلبہ، لمحات تنہائی اور ہمہ تن مصروف عبادت!

شمس تبریز کوئی منگتا قسم کے فقیر نہ تھے۔ وہ نام و نمود اور شہرت و عظمت کے شیدا بھی نہ تھے۔ وہ

تو عشق الہی میں سرشار ایسے بوریائشیں تھے جنہوں نے دنیاوی عیش و عشرت کو تیاگ دیا تھا اور ہر سرفرازی و سر بلندی کو ٹھوکر مار کر سلوک و معرفت کی وادی پر خار میں گم ہو گئے تھے۔

اُدھر، شمس تبریزی کے مطلوب مولانا جلال الدین رومی قونیہ میں اس طرح بود و باش اختیار کئے ہوئے تھے کہ ایک جانب مفتی اعظم کے عہدہ جلیلہ پر فائز تھے تو دوسری جانب مدرسہ کیقباد کی مسند مدرس اعلیٰ پر متمکن تھے۔ قیمتی لباس زیب تن تھا۔ فرشِ قالین پر نشست تھی۔ اعلیٰ درجے کا رکھ رکھاؤ تھا..... اور ارد گرد..... ہزاروں طالب علموں، نیاز مندوں، عقیدت کیشوں کا مجمع لگا رہتا۔ سلسلہ و غلط جاری رہتا۔ فتوے صادر کیے جا رہے ہوتے۔ علم و حکمت کی گتھیاں سلجھائی جا رہی ہوتیں۔ دانشمندی کے موتی زل رہے ہوتے..... یہ کیفیت، یہ صورت حال، یہ انداز اس فقیر بے ریا سے یکسر مختلف تھا جو بوسیدہ کملی میں لپٹا رہتا، جس کی زلفیں الجھی ہوئی تھیں، جس کی دراز داڑھی کے بال بے نیاز شانہ تھے۔ مگر..... جس کا سینہ انوار الہی سے روشن تھا۔

اور یہی آخری صفت اولی وقت کے عظیم عالم، مفتی اور مدرس کی شخصیت میں مفقود تھی۔ اسی خلا کو پُر کرنے کا بندوبست کسی مخلوق نے نہیں، خالقِ مخلوق نے کیا تھا اور وہ اس طرح کہ ایک رات مولانا نے روم نے خواب میں دیکھا کہ کوئی غیبی ندا ان سے ہم کلام ہے:

”جلال الدین! تم نے ظاہری علوم میں یقیناً اعلیٰ مقام حاصل کر لیا ہے۔ تفسیر، حدیث، فقہ میں مثالی درجہ رکھتے ہو۔ تمہارا تقویٰ بھی قابل تعریف ہے..... لیکن تم میں علوم باطنی ناپید ہے۔ جذب و سکر، صحو و سلوک اور قلبِ مجلی سے تم محروم ہو۔ معرفت و طریقت کی راہ سے نا آشنا ہو۔ لہذا تمہاری روحانی و باطنی تعلیم کے لیے ہم نے تمہارے پاس ایسے شخص کو بھیج دیا ہے جو بحر سلوک و معرفت کا ایک مشاق شنادر ہے۔ اس کا نام شمس الدین تبریزی ہے۔ اب اسے تلاش کرنا اور اس کی تعلیمات سے متمتع ہونا تمہارا کام ہے۔“

یہ صدا مولانا نے روم کے دل کی اتھاہ گہرائی تک اتر گئی۔ انہیں اس غیبی اطلاع سے یک گونہ سکون حاصل ہوا۔ ایک دین دار اور صوفی گھرانے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے وہ راہ سلوک میں گامزن ہونے کی تمنا ضرور رکھتے تھے..... مگر اس سلسلے میں ان کی تعلیم ہی کہاں ہوئی تھی۔ والد شیخ بہاء الدین ولد کی صحبت میں اس رمز سے تھوڑی بہت شناسائی ضرور ہوئی تھی۔ پھر، شیخ فرید الدین عطار سے مختصر سی

ملاقات اور ان کی کتاب ”اسرار نامہ“ نے اس جذبے کو ہلکا سا مہمیز کیا تھا۔ البتہ استاد بدرالدین محقق نے 120 دن کے چلنے کے دوران کچھ عارفانہ تربیت دی تھی، مگر راہ سلوک کا طویل سفر شروع ہی کہاں ہوا تھا۔ تین چلے بھلا کوئی حیثیت رکھتے ہیں؟

چنانچہ مذکورہ خواب میں دیئے گئے پیغام سے مولانا نے روم کو از حد خوشی محسوس ہوئی۔ یہ ایک عطیہ خداوندی تھا جو انہیں شمس تبریزی نامی شخص کی صورت میں ملنے والا تھا۔ مگر یہ خیالات بھی رہ رہ کے دل میں جاگزیں ہو رہے تھے:

”آخر یہ تبریزی نام کا شخص ہے کون؟ اور میں اسے کہاں تلاش کروں؟ میرے پاس اس کام کے لیے وقت ہی کہاں ہے۔ یہ درس و تدریس کا سلسلہ! یہ وعظ و پند کے فرائض! مفتی اعظم کی یہ ذمہ داری! ہزاروں طلباء کی یہ رہنمائی! لاکھوں فرزندان اسلام کی یہ رہبری! اُسے آنا ہے تو خود ہی آ جائے گا۔ میں کہاں کہاں سرگرداں پھروں۔“

پھر، مولانا جلال الدین رومی مذکورہ فرائض منصبی میں ایسے لگن ہوئے کہ انہیں خواب بھی یاد نہ رہا۔ راہ طریقت میں رہنمائی کے لیے آنے والے شمس تبریزی بھی ذہن و دل سے محو ہو گئے۔ اب وہ تھے، طلباء کا ہجوم تھا، فرائض منصبی تھے اور شان و شوکت سے پر زندگی کا انداز طمطراق!

ادھر شہر تبریز میں غیبی ندا سننے کے بعد شمس الدین اپنے وطن مالوف سے روانہ ہوئے اور قریہ قریہ کی خاک چھانتے ہوئے سوائے منزل رواں دواں تھے، ایک ”پرندے“ کی طرح!..... وہ آگے بڑھتے رہے، حتیٰ کہ قونیہ پہنچ گئے۔ وہاں انہوں نے خود کو ایک تاجر کے نام سے روشناس کرایا اور ایک سرانے میں مقیم ہوئے۔ مگر اندرون خانہ ایک خستہ چٹائی تھی، اینٹ کا ایک تکیہ تھا اور شکستہ سا ایک پیالہ تھا۔

بوریا تھا، کچھ شبینہ نے تھی یا ٹوٹے سبو
اور کیا اس کے سوا مستوں کے میخانے میں تھا
(شاد عظیم آبادی)

وہاں دعائے مستجاب کے ما حاصل مولانا رومی سے جس طرح ملاقات ہوئی، اس کا حال

”تقدیم“ میں پڑھ لیجیے¹۔

البتہ اس دوران ملاقات دو مرتبہ ادا کئے جانے والا یہ جملہ پھر زیر لب دہرا لیجیے:

”چیز یست کہ تونمی دانی!“

پہلی بار یہ جملہ مولانا نے کہا تھا جب ایک مجذوب نے ان کی کتاب اٹھائی تھی۔ پھر وہ اندرون حویلی چلے گئے تو شمس نے ساری کتابیں حوض میں ڈال دیں۔

جب تبریز کے اس نووارد درویش نے اپنا ہاتھ حوض میں ڈالا اور ساری کتابیں، سارے مسودے، سارے مخطوطے پانی سے نکال کر باہر رکھ دیئے جو بالکل صحیح سالم تھے تو وقت کے جید عالم و فاضل اور ظاہری علوم کے پیکر مولانا نے عالم حیرت میں اس انوکھے اور عجوبے کام کا سبب دریافت کیا تو شمس تبریزی نے جلال الدین رومی کا وہی جواب لوٹا دیا جب انہوں نے ایک خستہ حال، پھٹے پرانے کپڑے میں ملبوس درویش کو کتاب کی ورق گردانی کرتے وقت کہا تھا:

”چیز یست کہ تونمی دانی!“

مولانا جلال الدین رومی کو معاً اپنا ”خواب“ یاد آ گیا۔ دریافت کیا:

”آپ کہیں شمس تبریزی تو نہیں ہیں؟“

”ہاں! میں ہی ہوں۔ خدا نے مجھے تمہاری تربیت کے لیے بھیجا ہے۔“ انکارے جیسی سرخ

آنکھوں سے رومی کو گھورتے ہوئے جلالی درویش نے کہا۔ اور پھر.....

پوری طرح ملی بھی نظر سے نظر نہیں

عالم یہ ہو گیا کہ کچھ اپنی خبر نہیں

دنیاۓ اسلام کے نامور عالم دین، ممتاز فقیہ اور سلطنت کیقباد کے مفتی اعظم مولانا جلال الدین

1 شمس تبریز سے مولانا نے روم کی ملاقات کے متعدد واقعات درج کئے گئے ہیں۔ کہیں چوتھے کے سامنے سے مولانا کے شاگردوں کے جلوس میں گزرنے اور تبریزی کی ملاقات کا ذکر ہے تو کہیں ابن بطوطہ کے سفر نامے کا حوالہ دیا جاتا ہے جہاں یہ واضح ذکر ہے کہ ایک حلوائی حلوہ بیچتا ہوا آپ کے مدرسے میں پہنچا اور آپ نے اس شخص سے حلوہ مانگ کر کھایا۔ پھر آنا فانا آپ کی کاپی پلٹ گئی۔ مگر یہ سب باتیں اختراعی ہیں۔

رومی شمس تبریزی کے قدموں میں گر پڑے۔ آپ نے انہیں اٹھا کر سینے سے لگایا۔ پھر باقاعدہ بیعت کر کے اپنے حلقہ ارادت میں شامل کر لیا۔

یہ ڈرامائی ملاقات جو 28 نومبر 1244ء کو وقوع پذیر ہوئی تھی، نہایت وقیع و عریض اثرات کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ گویا مولانا رومی کے بحر حیات میں یہ ایک ایسا وزنی پتھر بن کر گری کہ اس کے تلاطم سے اٹھنے والی لہریں سب کچھ بہا کر لے گئیں اور بلخ کے خاندانِ خطیبی کا اکلوتا چشم و چراغ بزم صوفیا کا آبرو بن گیا۔

پھر کے نگاہ چار سو ٹھیری اسی کے روبرو
اُس نے تو میری چشم کو قبلہ نما بنا دیا
(نظیر اکبر آبادی)

انقلابِ حیات

تاریخِ عالم میں ایسی ساعت اور اس نوع کا لمحہ کبھی نہیں گزرا جو مدرسہ کی قیادت کے مدرسِ اعلیٰ کے وسیع و عریض مکان کے صحن میں اچانک وقوع پذیر ہوا۔ وہ ایک شخص تھا، بوریہ نشیں، کملی زیب تن کئے ہوئے، سرخ سرخ آنکھوں سے شعلے اگلنے والا۔ اینٹ کا تکیہ اور ٹوٹا پیالہ استعمال کرنے والا۔ چالیس چالیس دنوں تک فاقہ کرنے کی حالت میں خدائے قدوس کی عبادت میں منہمک رہنے والا۔ عالم ہاؤس سے الگ تھلگ زندگی بسر کرنے والا۔ اپنی ذات میں مگن! اپنے خیالات میں غرق! یہ تھے صوفی باصفا شمس تبریزی!

ٹھیک اس مجذوب کے سامنے قیمتی عبا، چغہ اور دستار میں ملبوس ایک ایسا شخص دبیز قالین پر فروکش تھا، علم و فضیلت میں کوئی اس کا مد مقابل نہ تھا۔ جس کا مطالعہ وسیع تھا، جس کی تعلیم محکم تھی، جس کا ہر استدلال وزنی، جس کی ہر رائے دقیق اور جس کا ہر فتویٰ اٹل ہوتا تھا۔ وہ ایک مجلسی آدمی تھا، بھیڑ بھاڑ پسند کرنے والا! جب وہ خچر پر سوار ہو کر گھر سے باہر نکلتا تو ہزاروں طلبا کا جاں نثار قافلہ اس کے جلو میں ہوتا۔ جب وہ وعظ کی بزم سجاتا تو سامعین کا ٹھانٹھیں مارتا ہوا سمندر ہر چہار جانب ابل آتا۔ اس کے ارد گرد عقیدت مندوں کی ایک فوج ظفر موج جمع رہتی۔ اس میں ادنیٰ بھی تھے اور اعلیٰ بھی! امیر بھی تھے اور فقیر بھی! بادشاہ بھی تھے اور رعایا بھی! افسرانِ حکومت بھی تھے اور کاروباری افراد بھی! علمائے دین بھی

شامل ہوتے اور عمائدین شہر بھی! اس طمطراق پسند شخص کو لوگ مولانا جلال الدین رومی کے نام سے یاد کرتے تھے۔

لیکن ایک بوریا نشیں اور گڈری پوش فقیر نے معانقہ کیا کیا، اس طمطراق پسند شخص کی دنیا ہی متبدل ہو گئی۔ اس نے درس و تدریس کا پرچم ہاتھ سے پھینک دیا۔ وعظ و تلقین کا سلسلہ ترک کر دیا۔ مفتی کی مسندِ جلیلہ کو لات مار دی۔ طلباء سے منہ پھیر لیا۔ عوام سے کئی کاٹ لی۔ جاہ و حشمت کو تیاگ دیا۔ مذکورہ بلند و برتر شخصیت آناً فاناً ہوا میں تحلیل ہو گئی۔ اب وہ تھا اور اس کا مرشد، محبوب اور پیا..... شمس تبریزی!

دونوں عاشق و معشوق خلوت گزریں ہو کر اسرار الہی کی بابت گفتگو کرنے لگے۔ توحید و رسالت، حقیقت و معرفت، سرچشمہ حسن مطلق، عشق کی صداقت، اتصالِ محبوب حقیقی کے رموز، وصالِ یار کے نکات، من و تو کا حد تقاضا..... غرضیکہ جملہ موضوعات طریقت زیر بحث آتے، کھل کر ان پر گفتگو ہوتی اور ہر نکتہ و اشکاف کیا جاتا۔ مولانا رومی سلوک و معرفت کے میدان کے ایک طفلِ مکتب بن کر پیر تبریزی کی عارفانہ گفتگو سنتے اور اسرار و رموزِ عرفان و صداقت سے آشنا ہوتے۔ انہیں شمس کی صحبت میں وہ لذت ملتی کہ پہروں ان ہی کے ساتھ خلوت نشیں رہتے۔ چلہ کشی بھی کرتے، صوم و صلوٰۃ کی پابندی بھی کرتے۔

ملاقاتِ شمس کے بعد مولانا نے روم کی کاپیٹ چکی تھی۔ کہاں تو یہ عالم تھا کہ رقص و نغمہ، سرود و ساز اور محفلِ سماع سے سخت احتراز تھا اور اب ہر لمحہ رقص کناں رہتے، ساز و سرود سے جی بہلاتے اور چنگ و رباب کی لے پر سر دھنتے۔ ایسی صورت حال میں نہ انہیں اب اپنے فرائض منصبی یاد رہتے نہ تدریس کی فکر لاحق ہوتی نہ وعظ و پند کی جانب طبیعت مائل ہوتی۔ بس وہ تھے اور صحبتِ شمس تبریزی!

مولانا نے روم کی اس تبدیلی ہیئت پر طلباء ہی نہیں، پورے عمائدین شہر برا فروختہ تھے۔ ان سبھوں کو حیرت تھی کہ تبریزی سے آنے والے گڈری پوش اور بوریا نشیں درویش نے ان کے ہر دل عزیز اور معزز رہنما پر کیسا جادو کر دیا ہے کہ وہ بس اسی کے ہو کر رہ گئے ہیں۔ نہ کہیں آتے ہیں نہ جاتے ہیں۔ اب ان میں نہ وہ طمطراق ہے نہ ہی شان و شکوہ کے آثار!..... وہ تو بس دیوانے سے نظر آنے لگے ہیں۔

ادھر شمس تبریزی حسب ارادہ اپنے مرید کو اسرار و رموز طریقت کی تعلیم دیتے رہے۔ روحانیت کی پیچ در پیچ منازل طے کراتے رہے۔ عشق حقیقی کے آداب سکھاتے رہے۔ قرب الہی کی راہ سے آشنا

کرتے رہے۔ جب مولانا رومی میں ”پیر رومی“ کے آثار پوری طرح جلوہ گردیکھے تو ایک دن مرید کے آداب اطاعت کو آزمانا چاہا۔ چنانچہ بول اٹھے:

”جلال الدین! مجھے اس وقت ایک خوبصورت عورت کی خواہش ہے۔ میں تم سے اس وقت خوش ہوں گا جب تم میرے لئے ایک خوبصورت اور جوان رعنا عورت لا دو گے۔“

مولانا نے روم نے بغیر کسی پس و پیش کے اپنی اہلیہ کو جو حسن و جمال کا پیکر تھی، اپنے مرشد تبریزی کی خدمت میں پیش کر دیا۔ جب انہوں نے اپنے سامنے مولانا رومی کی بیوی کو دیکھا تو فرمانے لگے:

”میں نے تمہیں اس عورت کے لیے تو نہیں کہا تھا۔ یہ تو میری بیٹی ہے۔“

پیر کی یہ بات سن کر مولانا نے کہا:

”مرشدی! میری نگاہ میں اس سے بہتر اور حسن و جمال میں یکتا اور کوئی عورت نہ تھی، لہذا اسے پیش کر دیا۔ ویسے میری یہی خواہش ہے کہ اپنی خوب سے خوب تر چیز آپ کے قدموں میں نثار کر دوں۔“

یہ گفتگو سن کر شمس تبریزی نے مولانا سے یہ کہا:

”مجھے اب عورت کی خواہش نہیں ہے۔ اگر تم لا سکو تو ایک خوبصورت سانو خیز لونڈا لا دو۔“

یہ حکم سنتے ہی مولانا جلال الدین رومی نہایت سرعت کے ساتھ اندرون خانہ گئے اور اپنے چھوٹے بیٹے کو لا کر مرشد کی خدمت میں پیش کر دیا۔ مرشد اس مرتبہ پھر خفا ہوئے اور مرید سے کہنے لگے:

”میں نے تمہیں یہ لڑکا لانے کو تو نہیں کہا تھا۔ یہ تو میرا بیٹا ہے۔“

مولانا نے پیر کی یہ بات سنی تو پہلے کی طرح گویا ہوئے:

”یا مرشدی! میں آپ کا غلام اور حکم کا بندہ ہوں۔ اپنی ہر اچھی اور پسندیدہ چیز آپ پر قربان کر دینے کی تمنا رکھتا ہوں۔“

اپنے مرید کی یہ باتیں سن کر پیر شمس تبریزی نے لڑکے کو بھی واپس کر دیا۔ پھر یوں گویا ہوئے:

”اب جاؤ اور میرے لئے شراب کا بندوبست کرو۔ ایسی مے لاؤ جس سے مجھ پر کیف دستی چھا جائے۔“

مولانا جلال الدین رومی عالم دین تھے، مفتی اعظم تھے، فقیہ اور واعظ تھے، فتویٰ نویس تھے، دینی مدرسے کے مدرس اعلیٰ تھے، امام تھے، خطیب تھے..... لیکن مرشد کا حکم سننے کے بعد یہ سارے عہدے، سارے فرائض یکنخت فراموش کر گئے اور سیدھے قونیہ کے ایک ایسے محلے میں پہنچے جو یہودیوں کا قریہ کہلاتا تھا۔ وہاں شراب کی ایک دکان تھی۔ دو بوتل شراب کی خریدی اور اپنی چادر میں اچھی طرح چھپا کر تیز تیز قدم سے مرشد کی جانب چل پڑے۔ سامنے سے کوئی جوان عورت چلی آ رہی تھی۔ مولانا نہایت تیزی میں تھے چنانچہ اس سے ٹکرائے۔ بیچ چوراہے پر وہ بھی گرے، عورت بھی گری اور شراب کی بوتلیں بھی! اسی وقت وہ چادر جس سے وہ منہ پر بکل مارے ہوئے تھے، بدن سے الگ ہو گئی۔

لوگوں نے دیکھا کہ مشہور زمانہ مفتی اور عالم دین اس طرح سڑک پر گرے ہوئے ہیں کہ قریب میں نو جوان عورت بھی پڑی ہوئی ہے، شراب کی بوتل بھی پاس ہی ٹوٹی ہوئی ہے اور سڑک پر شراب بہ رہی ہے۔ بد مستی کا یہ انوکھا منظر دیکھ کر راہگیروں نے خوب مذاق اڑایا، تالیاں بجائیں اور بھپتی کسی۔ بیچارے مولوی رومی شرمسار اٹھے اور سیدھے شمس تبریز کی خدمت میں پہنچے۔ ساری کیفیت بیان کی۔ آپ یہ ساری روداد سنتے رہے۔ پھر فرمایا:

”اے جلال الدین! آج تمہاری سلوک و معرفت، جذب و سکر اور صحو کی ساری منزلیں طے ہو گئی ہیں۔ میں نے تمہارے سامنے عورت، لڑکے اور شراب کی جس خواہش کا اظہار کیا تھا، یہ ایک آزمائش تھی اور تم جس طرح اس میں پورے اترے ہو، اس کی مثال نہیں ملتی۔ آج سے تمہیں وہ مقام حاصل ہو گیا ہے جس سے تمہارا نام رہتی دنیا تک قائم رہے گا۔ لوگ تمہاری کتابیں قیامت تک پڑھتے رہیں گے اور میں دنیا میں گناہ ہو جاؤں گا، مگر تمہارے مرشد کی حیثیت سے پہچانا جاؤں گا۔“

گرچہ سلوک و معرفت کی دنیا میں مولانا نے روم کو ایک امتیازی مقام حاصل ہو گیا تھا، لیکن اردگرد کی فضا غصہ و غم سے معمور تھی۔ جہاں طلباء اپنے استاد اور اس کے پیر سے کبیدہ خاطر تھے، وہاں اہل خاندان بھی سخت ناراض تھے۔ ان میں مولانا کی اہلیہ کرا خاتون بھی تھیں۔ انہیں بھی اس بات کا صدمہ تھا کہ وہ شمس تبریز ہی کے ہو کر رہ گئے ہیں۔ یہ بھی پتہ نہ تھا کہ آخر یہ دونوں بند کمرے میں کرتے کیا ہیں؟ اس سلسلے میں موصوفہ نے ایک واقعہ بیان کیا تھا جو کچھ اس طرح ہے:

”وہ سردی کا زمانہ تھا۔ ہمارے گھر کے ایک کمرے میں میرے شوہر اور شمس تبریز خلوت گزریں تھے۔ میں دروازے کی دراڑ سے جھانک کر یہ دیکھنا چاہ رہی تھی کہ دونوں کرتے کیا ہیں۔ اچانک کمرے کے پیچھے والی دیوار درمیان سے پھٹ گئی اور نورانی شکل و صورت کے چھ پیکر اسی دراڑ سے اندر داخل ہوئے۔ ان سرپائے نور ہستیوں نے جلال اور شمس کو سلام کیا اور ان کے سامنے پھولوں کا ایک گلدستہ رکھ دیا۔ پھر وہ سب خاموشی کے ساتھ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے بیٹھ گئے۔ یہاں تک کہ نماز فجر کا وقت آن پہنچا۔ تب ان منور نورواروں نے شمس سے امامت کرنے کی درخواست کی، لیکن انہوں نے معذرت کر لی۔ تب امامت کا یہ اعزاز جلال کو بخشا گیا۔ انہوں نے یہ فریضہ امامت اتنے اچھے، مؤثر انداز میں اور سادگی کے ساتھ انجام دیئے کہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

جب نماز فجر ادا کر دی گئی تو یہ چھ کے چھ اجنبی افراد اسی روز ن دیوار سے واپس چلے گئے جس سے وہ آئے تھے۔ ازاں بعد، جلال کمرے سے نکل کر سیدھے میرے پاس آئے۔ انہوں نے پھولوں کا گلدستہ مجھے پیش کرتے ہوئے کہا:

”ان کا خاص خیال رکھنا۔“

دوسرے دن میں نے گلدستے سے چند پھول نکالے اور عطر فروشوں کے بازار پہنچی تاکہ معلوم کروں کہ یہ پھول کہاں سے آئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے اس طرح کے خوشبودار اور خوش رنگ پھول زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ ہر عطر فروش پھولوں کی تروتازگی، رنگت اور خوشبو سے سراپا ششدر تھا۔ اتفاق سے مصالحہ جات کا ایک ہندوستانی تاجر اس وقت وہاں موجود تھا۔ وہ ان پھولوں کو دیکھتے ہی چلا اٹھا:

”یہ پتیاں تو ایک خاص پھول کی ہیں جو صرف جنوبی ہند کے ایک خاص مقام میں پایا جاتا ہے۔ یہ تو نیہ میں کس طرح آ گیا ہے اور وہ بھی سردیوں کے شباب میں۔ ان کا یہاں کیا کام؟“

میں حیران و ششدر گھر واپس آ گئی۔ جب میری نظر جلال پر پڑی تو وہ مجھے نہایت تاکید سے کہہ رہے تھے کہ ان پھولوں کی بھرپور انداز میں حفاظت کرو۔ یہ ایک گناہ جنت ارضی کے پھول ہیں جو مجھے تحفے میں دیئے گئے ہیں۔“

احمد الافلاکی نے کراخاتون کا یہ واقعہ اپنی مشہور کتاب ”مناقب العارفین“ میں درج کرنے کے بعد لکھا ہے:

”کراخاتون نے اپنی تمام عمر ان پھولوں کی دل و جان سے حفاظت کی۔ ان کی پتیاں علاج معالجے میں استعمال کی جاتیں اور اندھوں کی بینائی بحال کرنے میں کام آتیں۔ کراخاتون کے پاس رکھے ہوئے یہ پھول اسی طرح تروتازہ اور خوشبودار تھے جیسا کہ اس روز تھے جب روزن دیوار سے چھ نورانی شکل و صورت کے لوگوں نے کمرے میں آ کر شمس و جلال کو پیش کئے تھے۔“

یہ سب کچھ تھا مگر ظاہری علوم کے شیدائی شمس تبریزی سے متنفر ہو چکے تھے۔ اس نووارد شخص نے قونیہ کی باغ و بہار شخصیت کو ان سے چھین لیا تھا۔ شہر کی طمطراق والی رونق ختم کر دی تھی۔ نہ اب جلوس نکلتا تھا، نہ وعظ کی مجلس جمتی تھی، نہ سلسلہ درس و تدریس باقی رہا تھا۔ گویا شمس تبریزی نے ان کے رہنما مولانا رومی کو ہی نہیں چھینا تھا، حسن قونیہ بھی چھین لیا تھا۔ چنانچہ مرشد رومی کے خلاف رنجش بڑھتی گئی۔ معاندانہ رویے اپنائے گئے۔ تذلیل کا ہر حربہ استعمال کیا گیا۔ حد تو یہ کہ خود مولانا رومی کا لڑکا علاء الدین محمد جب اپنے والد سے ملنے آیا کرتا تو اس خیمے سے ہو کر گزرتا جسے مولانا نے خاص شمس تبریزی کے لیے نصب کروائے تھے اور جہاں وہ فروکش تھے۔ اس طرح کی آمد و رفت سے ان کی عبادت و ریاضت میں خلل پڑتا۔ لیکن رومی کا متنفر بیٹا شمس تبریزی کے بار بار کہنے کے باوجود اپنی عادت سے باز نہ آیا اور اُلٹا ان کے خلاف محاذ قائم کر لیا۔

اس طرح شورش پھیلتی چلی گئی، ہنگامہ بڑھتا گیا اور قونیہ کی فضا مکدر ہو گئی۔ شمس تبریزی ایسا نہیں چاہتے تھے۔ وہ اللہ لوگ تھے۔ خلوص و محبت کے پیکر تھے۔ انسان دوستی کے پرچارک تھے۔ خون ابن آدم بہانے والوں میں نہ تھے۔ چنانچہ ایک دن نہایت خاموشی سے قونیہ سے چلے گئے، حتیٰ کہ اپنے چہیتے مرید مولانا رومی کو بھی بھنک نہ پڑنے دی۔

ان کا غائب کیا ہونا تھا، دل رومی پر قیامت گزر گئی۔ ان کی دنیا اجڑ گئی۔ شمس تبریزی ایک بحر بے کنار تھے..... طریقت کے، معرفت کے، تصوف کے، علوم باطنی کے۔ ابھی مولانا نے اپنی اندرونی تشنگی بجھائی کہاں تھی کہ وہ بحر بے کنار ہی گم ہو گیا۔ رومی پیاسے رہ گئے اور ماہی بے آب کی طرح تڑپنے

لگے۔ اپنے مرشد، اپنے معشوق، اپنے پیا کی جدائی میں باؤ لے باؤ لے سے نظر آنے لگے۔ نہ دن کو چین، نہ رات کو آرام! گو بہ گو اور قریہ بہ قریہ تلاش مرشد میں پھرنے لگے۔ اپنے مریدوں اور عزیزوں کو لے کر دمشق تک گئے۔ ہر طرف سراغ رسانی کی، لیکن پیرو مرشد کا کچھ پتہ نہ چل سکا۔

ایک ایسی شخصیت کا گم ہونا جس سے مولانا نے روم کو دلی انسیت تھی، کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ عالم فرقت میں سخن سنجی کی دبی ہوئی چنگاری ابھر کر شعلہ جوالہ بن گئی اور وہ فرقتِ محبوب میں شعر کہنے لگے۔ غزلوں پر غزلیں لکھ کر درد دل کی عکاسی کرنا ان کا شیوہ بن گیا..... اور یہ غزلیں کیا تھیں، فراق کے اذیت ناک لمحوں کی جیتی جاگتی تصویر تھی۔ یادِ معشوق میں تارے گن گن کر شبِ ب سری کا درد ناک نوحہ تھا..... یہ غزل پارے محض مولانا رومی کے دل محزوں کی ترجمانی نہیں کر رہے تھے، ہر سچے عاشق کا جیتا جاگتا المیہ تھے۔

اگر ہم چند لمحے کے لیے رک کر غور کریں تو مولانا نے رومی کی آفاقی شاعری کا آغاز دراصل اسی لمحے ہو گیا تھا جب ایک بوریانٹھیں اور گڈری پوش فقیر نے ان سے معانقہ کیا تھا۔ اس سے قبل رومی سب کچھ تھے، شاعر تو نہ تھے۔ اور شاعری کی چنگاری اسی استادِ کامل کی روپوشی کے نتیجے میں ابھرائی تھی۔ گویا شمس تبریز نے عشقِ حقیقی کی تعلیم خود اپنی ذات کو محور بنا کر دی تھی جس کے تانے بانے معشوقِ حقیقی کی ذات بے ہمتا سے مل رہے تھے۔ اور جب یہی ذاتِ ارضی گم ہوئی تو گویا فرقت کا شعلہ محض اسی پیکر آب و گل کے لیے بھڑکانہ تھا، ازلی روشنی کے لیے بھی تن و جاں کو تنور بنا گیا تھا۔

اور اسی عشق کے تنور میں ہمہ وقت جلتے رہنے کے نتیجے میں جس ”دیوانِ شمس تبریز“ کا آغاز ہوا، وہ ایسا مکمل شہ پارہ ہے، جس کی اپنی انفرادیت، اپنا رنگ، اپنا انداز اور اپنا حسن بیان ہے۔ لیکن مثنوی رومی کے دھوم دھڑکے نے لوگوں کو اسی بحث میں الجھا کر رکھ دیا کہ

”یہ دیوانِ شمس تبریز کا ہے کہ مولانا رومی کا؟“

ہمارے ناقدوں نے فقیرِ منش تبریزی کو بھی شاعروں کی صف میں کھڑا کر دیا، محض اس بنا پر کہ مختلف غزلوں کے مقطع میں ”شمس“ بطور تخلص استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن دل کی آنکھ سے یہ نہ دیکھا کہ یہ محض عقیدت کا جذبہ تھا، انسیت کا رنگ تھا اور عشق کا کارنامہ تھا۔ شمس تبریز کا مشن تو دلِ رومی میں دبی

ہوئی شعر و سخن کی چنگاری کو بھڑکانا تھا..... سو بھڑکایا اور روپوش ہو گئے۔

شمس تبریز کو یقیناً اس بات کا احساس رہا ہوگا کہ ان کی جدائی میں ان کے مرید صادق پر کیا گزر رہی ہوگی۔ بہت ممکن ہے کہ خود ان کے دل میں بھی رومی کی یاد کی لہریں متحرک ہو رہی ہوں..... اس لئے کہ عشق کی آگ ایک ہی طرف نہیں، دونوں جانب بھڑکتی ہے۔

دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی

چنانچہ موصوف گم شدہ نے دمشق سے اپنی خیریت کا خط بھیجا تا کہ دلِ رومی کو تسلی ہو۔ نتیجتاً استاد کامل کا مکتوب پا کر مولانا کے دل کا کنول روشن ہو گیا۔ اپنے بیٹے سلطان ولد کو مرشد کے پاس اس انداز سے بھیجا کہ

• پیر کے آستانے پر نچھاور کیے جانے کے لیے ہزار دینار سرخ تھے۔

• منظوم خط تھا۔

• کئی عاشقانہ غزلیں تھیں۔

یہ چیزیں پا کر شمس مسکرائے۔ ان کی یہ مسکراہٹ نفسیاتی لحاظ سے بے حد معنی خیز تھی۔ یعنی عاشق کے دل میں لگی ہوئی آگ شعلہ جوالہ بن گئی ہے..... اور شمس تبریزی کا مقصد بھی تو یہی تھا۔ اس کی تصدیق ان کے اس جملے سے ہوتی ہے:

”ان خرف ریزوں کی ضرورت نہیں۔ مولانا کا پیام کافی ہے۔“

پھر، شمس تبریز سلطان ولد کی ہمراہی میں واپس قونیہ آ گئے۔ یہ آمد بہارِ مجسم مولانا جلال الدین رومی کے لیے فرحت افزا ثابت ہوئی۔ ان کا اضمحلال ختم ہو گیا۔ ان کی کبیدہ خاطر روپوش ہو گئی۔ دل کی بے کلی جاتی رہی۔ اب وہ تھے، شمس تبریزی کا روحانی پیکر تھا اور عارفانہ سلسلہ جنابانی!

لیکن وہی اعزہ و احباب جو رومی کی فرقتِ مرشد میں بے تابی و بے کلی کو دیکھ کر شمس تبریزی سے محاصمت کرنے پر شرمندہ ہوئے تھے، وعدے و وعید کیے تھے اور یقین دلایا تھا کہ اب ان دونوں کے معاملے میں وہ لوگ کچھ نہیں بولیں گے۔ مگر یہ عہد و پیمان عارضی ثابت ہوا۔ وہ پیر و مرید کی یکجائی پر پھر برا فروختہ ہو گئے۔

آخر بار بار مخلصت کا رویہ رومی خاندان والے کیوں اپناتے تھے۔ اعزہ و احباب فقیر تبریز سے کیوں بدکتے تھے۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس جانب مورخین نے غلط طریقے سے اپنی تجزیاتی توجہ مبذول کی ہے۔ کسی سوانح نگار رومی نے انسانی نفسیات کو دوران تجزیہ بروئے کار نہیں لایا ہے۔ آئیے، اس پہلو پر ایک نظر ڈال لیں۔

ذرا ملاقات شمس تبریزی سے پہلے کا ماحول دیکھئے۔ مولانا جلال الدین رومی اعلیٰ عہدے پر متمکن تھے۔ سلطان کیقباد کے شاہی مدرسے کے مدرس اعلیٰ تھے۔ حکومتِ وقت کے قاضی و مفتی تھے۔ واعظ تھے۔ ان کی مجلس میں آ کر بیٹھنے والوں میں بادشاہ وقت بھی تھے، افسران سلطنت بھی تھے، عمائدین شہر بھی! پھر بیرون شہر سے آنے والوں کا بھی تانتا بندھا رہتا تھا..... یہ تفاخر، یہ شان، یہ طمطراق، یہ عزت و احترام، یہ رعب و دبدبہ صرف ملکیت رومی ہی تو نہ تھی، اہل خاندان کا بھی اس میں وافر حصہ تھا۔ مولانا رومی کا ہر اعزاز اعزہ کا اعزاز تھا۔ ان کی ہر قدر افزائی اہل خاندان کی قدر افزائی تھی۔ وہ جب قونیہ کے بازار سے گزرتے تو مولانا جلال الدین رومی کے عزیز ہونے کے ناطے ان کی عزت کی جاتی۔ ان کے لئے سر راہ آنکھیں بچھائی جاتیں۔ کیا کیا کچھ نہ ہوتا تھا۔

مگر..... قونیہ میں شمس تبریزی کے ورود کے بعد ہر چیز بدل گئی۔ پہلے جیسا منظر طمطراق ہی نہ رہا۔ پوری ریاست کا عظیم و جلیل فرد ایک مجذوب کا حلقہ بگوش بن کر خود بھی مجذوب بن گیا تھا۔ ان تمام تغیرات کا بانی مہانی خواجہ شمس الدین تبریز کو سمجھا گیا تھا۔ لامحالہ انہی سے نفرت کی گئی اور ان کی دوسری آمد کے بعد دلوں کی کدورت اتنی بڑھی کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قونیہ سے چلے گئے۔

شمس کے مستقلاً روپوش ہو جانے سے رومی کے اعزہ و احباب کو یقیناً خوشی ہوئی ہوگی..... مگر عارضی! اس لیے کہ مولانا کا پہلا جیسا دور پلٹ کر نہیں آیا، جس کے وہ لوگ متمنی تھے۔ لیکن یہ حقیقت واضح کر دی جائے کہ شمس تبریزی کی گمشدگی ہی مولانا جلال الدین رومی کو مولویٰ معنوی بنانے کا موجب ٹھہری۔ اگر یہ ملاقات نہ ہوتی، یہ انقلاب حیات رونما نہ ہوتا تو مولانا رومی سب کچھ ہوتے، ”دیوان شمس تبریز“ کے خالق اور ”ہست قرآں در زبان پہلوی“ کہلانے والی مثنوی کے عظیم شاعر ہرگز ہرگز نہ ہوتے۔ بقول ان ہی کے:

مولوی ہرگز نشد مولائے روم

تا غلامِ شمس تبریزی نشد

(میں کبھی بھی مولانا روم نہ ہوتا اگر مجھ کو شمس تبریزی کی غلامی میسر نہ آتی۔)

شمس تبریز نے اپنے اس معنوی غلام کے سینے میں عشق کی جو چنگاری روشن کی تھی وہ شعلہ
جوالہ بنتی گئی۔ اس کو تیز تر کرنے میں کبھی شیخ صلاح الدین زرکوب کی معیت کارگر ثابت ہوئی اور کبھی
حسام الدین چلپی کی رفاقت ممد و معاون ثابت ہوئی۔ اس طرح بلخ کے جلال الدین شعر و سخن کی راہ
طے کرتے ہوئے مولانا رومی کے روپ میں اس طرح جلوہ گر ہوئے کہ اب تک ان کا کوئی مد مقابل
نہیں ہوا۔

سارے عالم پہ ہوں میں چھایا ہوا

مستند ہے مرا فرمایا ہوا

بہ حیثیت صوفی باصفا

نویں صدی عیسوی کے ایک ممتاز ولی اور صوفیائے کرام کے سرخیل حضرت جنید بغدادیؒ نے ایک مرتبہ یہ فرمایا تھا:

”صوفی کی حیثیت زمین کی مانند ہوا کرتی ہے۔ اس پر دنیا بھر کی غلاظت اور گندی اشیاء پھینک دی جاتی ہیں۔ لیکن اس سے صاف ستھری اور دلکش چیزیں ہی برآمد ہوتی ہیں۔“

حضرت جنید بغدادیؒ کا یہ قول بنی برحقیقت ہے۔ یہ صوفی کی ذات ہے جو خیر کا منبع، اچھائی کا سرچشمہ، بنی نوع انسان کا غم خوار اور ہر کس و ناکس کا خیر خواہ ہوتا ہے۔ اس کا نورانی سراپا نسیم جاں فزا کے جھونکے کی مانند ہوتا ہے جو ہر اس چیز کو نہایت محبت آمیز اور شفقت خیز انداز میں مس کرتا ہے جو اس کی راہ میں آ جاتی ہے۔ اس میں من و تو کا شائبہ، امیر و غریب کا تفرقہ اور بلند و پست کا تصور جاگزیں نہیں ہوتا۔ تصوف کی یہ باد بہاری ذات پات، رنگ و نسل اور فرقہ و قبیلے سے بے نیاز ہر بندہ خدا کو مستفیض کرتی ہے۔

تصوف کے فرحت بخش جھونکوں سے بنی نوع انسان کو شاد کام کرنے والے یہ صوفیائے کرام اللہ رب العزت کے آخری نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے آخری خطبے میں دی گئی تعلیمات پر سختی سے کار بند رہے اور دوسروں تک انہیں پہنچانے کے لیے ہر آن سرگرم عمل بھی رہا کرتے۔ مذکورہ خطبہ

حجۃ الوداع میں آنحضرتؐ نے فرمایا تھا:

”لوگو! میں تمہارے درمیان ایک چیز چھوڑے جا رہا ہوں۔ اگر تم اسے سختی سے پکڑے رہو گے تو میرے بعد کبھی راستے سے بھٹک نہیں سکو گے۔ یہ چیز قرآن ہے۔“

اے لوگو! اعمال میں خلوص و صداقت، مسلمان بھائیوں کے لیے بھلائی کا جذبہ اور آپس میں اتفاق..... یہ تین ایسی چیزیں ہیں جو دلوں کو پاک صاف رکھتی ہیں۔“

صوفیائے کرام نے اللہ کے آخری رسولؐ کے ارفع و اعلیٰ فرمودات پر خلوص دل کے ساتھ عمل کیا اور آپؐ نے ہدایت کی جو ابدی شمع روشن کی تھی اس کی روشنی میں راہ حیات طے کرتے رہے۔ یہ بات مبنی برحقیقت ہے کہ اللہ کے یہ نیک صفت اور برگزیدہ بندے نہایت جوش و جذبے کے ساتھ قرآنی تعلیمات پر عمل پیرا رہے اور وہ احادیث نبویؐ کو چراغ راہ بھی بنائے ہوئے تھے۔

اگر ہم صوفی باصفا کے کردار کا تجزیہ کریں تو ان میں مندرجہ ذیل خصوصیات بدرجہ اتم پائیں گے:

- ☆ اپنی ذات کی نفی
- ☆ ہر آن تصور باری تعالیٰ
- ☆ دنیاوی خواہشات سے بے نیازی
- ☆ زندگی کی صداقت سے پوری آشنائی
- ☆ ذہن و دل غیر حق سے پاک
- ☆ مزاج قلندرانہ
- ☆ نام و نمود سے گریز
- ☆ بنی نوع انسان سے محبت
- ☆ عجز و انکسار
- ☆ کسی امتیاز کی وجہ سے دوسروں پر اپنی برتری ظاہر کرنے سے گریز
- ☆ ہمہ تن عبادت و ریاضت میں مصروفیت
- ☆ مراقبہ کا تسلسل

- ☆ اوراد و وظائف کی پابندی
- ☆ انسان کی دل آزاری سے پرہیز
- ☆ محلاتِ شاہی اور دربارِ حکمرانی سے اجتناب
- ☆ قوتِ برداشت
- ☆ پرسکون مزاج
- ☆ ہوائے نفسانی پر کنٹرول
- ☆ ہر مذہب اور فرقے کے لوگوں سے پیار
- ☆ دنیاوی حکمرانوں کے برعکس اللہ تعالیٰ کی حاکمیت پر یقین و اعتماد

یہ تصوف ہی تو ہے جس نے من و تو کے بُت کو پاش پاش کر دیا ہے، ایک دوسرے کے ساتھ تعصب کرنے سے گریزاں رہا ہے، شان و شکوہ کی جڑیں کاٹی ہیں اور دنیاوی جاہ و مرتبہ کے احساس کا قلعہ قمع کیا ہے۔ حد تو یہ کہ صوفی کی فقیرانہ بزم میں کوئی امتیاز روا نہیں، کوئی چھوٹا بڑا نہیں، محض اس لئے کہ اللہ کی نگاہ میں سب برابر ہیں۔ گویا وہ ہر معاملے کو رضائے الہی کے نظریے سے دیکھتا ہے۔ اس کا ”موٹو“ بس یہی ہے:

اپنی رضا وہی ہے جو ہے رضائے دوست!

اگر ہم کسی صوفی باصفا کی خدمات، اس کے کردار، اس کے جذبے اور حسن کارکردگی کا مجمل انداز میں احاطہ کرنا چاہیں تو بس انشاء اللہ خاں انشا کے مندرجہ ذیل اشعار اس کی عکاسی کر سکیں گے۔

جو چھوٹے چھوٹے پود لگائے تھے خیر سے
 نامِ خدا ہوئے وہ سرراہ کے درخت
 الفت نہ ان سے کیوں کر ہمیں ہو کہ ہم غریب
 اللہ کے فقیر یا اللہ کے درخت

یہ صوفیائے کرام اللہ کے فقیر ہی نہیں اللہ کے درخت بھی ہیں جو زمین کی غلاظت کو جذب کرتے ہیں اور اپنے وجود سے ہر شے کو پُر نور بنا دیتے ہیں..... اور ہمارے مولانا نے روم بھی ان ہی

صوفیوں کی صفِ اولین میں ہیں جن کی ذات کی بدولت کوڑا کرکٹ سے لدی پھندی زمین سے گل بوٹے اُگے ہیں، سبزے نمایاں ہوئے ہیں، بادِ بہاری چلی ہے اور دلوں کو تروتازگی حاصل ہوئی ہے۔ آخر مولانا کو دنیائے تصوف میں اتنا باوقار مقام کس طرح حاصل ہوا؟ آئیے، اس کا جائزہ لیے لیتے ہیں۔

جیسا کہ ہم ابتدائی ابواب میں مطالعہ کر چکے ہیں، مولانا جلال الدین رومی کے دادا حسین خطیبی بہت بڑے صوفی اور صاحبِ جلال شخص تھے۔ مولوی روم کے والد بہاء الدین ولد بھی سلوک و طریقت کے مرد میدان تھے۔ لیکن مولانا کو ان دونوں سے اس ضمن میں براہِ راست کوئی تعلیم حاصل نہیں ہوئی تھی۔ ان کی پیدائش سے بہت قبل دادا کا انتقال ہو چکا تھا۔ والد بزرگوار نے انہیں ابتدا میں دینی تعلیم تو دی تھی، مگر اپنی بے پناہ مصروفیات کے سبب سلوک و معرفت کے کوچے کی سیر نہیں کرا سکے تھے۔ انہوں نے اپنے ایک شاگرد اور مرید برہان الدین محقق کو بیٹے کا تالیق اور استاد مقرر کر دیا تھا جنہوں نے مروجہ تعلیم تو دے دی تھی مگر صوفیانہ مسلک سے رومی کو آگاہ نہیں کر سکے تھے۔

جب مولانا روم کے والد شیخ بہاء الدین ولد کا انتقال ہوا اور برہان الدین محقق (جو اس وقت اپنے وطن ترمذ میں تھے) یہ خبر سن کر قونیہ پہنچے تو پھر جو صورت سامنے آئی اس کا ذکر علامہ شبلی نعمانی نے اس طرح کیا ہے:

”قونیہ میں شاگرد استاد کی ملاقات ہوئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو گلے لگایا اور دیر تک دونوں پر بے خودی کی کیفیت رہی۔ افاقے کے بعد سید نے مولانا کا امتحان لیا۔ جب تمام علوم میں کامل پایا تو کہا کہ ”علم باطنی رہ گیا ہے اور یہ تمہارے والد کی امانت ہے جو میں تم کو دیتا ہوں۔“ چنانچہ نو برس تک طریقت اور سلوک کی تعلیم دی۔“

اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو یہ ایک طرح سے روحانیت کی ظاہری تعلیم تھی۔ مولانا کی راہِ طریقت کی جانب رہنمائی کردی گئی تھی مگر انگلی پکڑ کر چلایا نہیں گیا تھا..... اس لئے کہ یہ اعزاز کسی اور کے نصیب میں تھا..... اور ان کا نام تھا شمس تبریز!..... ان کے پیر بابا کمال الدین جندی نے حکم دیا تھا:

”رُوم جاؤ۔ وہاں ایک دل سوختہ ہے، اس کو گرم کر آؤ۔“

یوں ظاہر ہوتا ہے کہ بدرالدین محقق نے نہاں خانہ دلِ رومی میں عشق کی لکڑیاں جمع کر دی تھیں۔ ان کو چقماق سے روشن کرنا، آگ جلانا اور الاؤ تیار کرنا شمس تبریز کے مقدر میں تھا۔

جب تبریز کے یہ مجذوب قونیہ پہنچے اور ملاقاتِ رومی وقوع پذیر ہوئی تو پھر..... تصوف کا رنگ مولانا پر ایسا چوکھا چڑھا کہ ظاہری سارے رنگ کا فور ہو گئے۔ پہلے جیسا وہ طمطراق رہا نہ شان و شکوہ! گویا ہر چیز بدل گئی۔ صرف مجلسِ رومی ہی نہیں، پورا قونیہ ہی بدل گیا۔ اب وہاں کچھ بھی نہیں رہا تھا۔

آخر آنا فانا یہ کس طرح ہوا۔ ایک آن میں قبائے رومی اور دستارِ جلال کس طرح اتر گئی۔ کس طرح مسندِ فضیلت لپیٹ دی گئی اور بوریائے بوذرا اپنا لیا گیا۔ اس کا ایک راز ہے۔ آئیے، کچھ سراغ لگائیں۔

- علومِ باطنی علومِ ظاہری سے بالکل مختلف چیز ہے۔ آخر الذکر کا تعلق دماغ سے ہوا کرتا ہے، لیکن اول الذکر دل کے کلبہٴ احزاں سے مربوط و منسلک ہوتا ہے۔
- یہ وہ کوچہٴ عارفانہ ہے جہاں نہ فلسفے کی دال گلتی ہے، نہ منطق کا جادو چلتا ہے اور نہ سائنس کی دیسہ کاری کا رگر ہوتی ہے۔

- ذرا یاد کیجئے مدینہٴ منورہ کا وہ منظر جب اللہ کے پیارے رسولؐ نے اپنا روئے مبارک یمن کی طرف کر کے فرمایا تھا کہ ”مجھے یمن کی جانب سے محبت کی خوشبو آتی ہے۔“

یہی خوشبوئے محبت ہے جو علومِ باطنی کی محرک بنتی ہے۔ اس سے دل کا گلستاں سرسبز و شاداب رہتا ہے۔

جب آنحضرتؐ نے حضرت اویس قرنیؓ کا مفصل ذکر فرمایا تو صحابہ کرامؓ نے آپؐ سے یہ دریافت کیا کہ کیا انہوں نے اللہ کے رسولؐ کو دیکھا ہے؟ اللہ کے آخری پیغمبرؐ نے فرمایا:

”ظاہر کی آنکھ سے نہیں دیکھا، دل کی آنکھ سے دیکھا ہے۔“

یہی دل کی آنکھ ہے جو زمان و مکاں سے پرے، سب کچھ دیکھ لیتی ہے، اس لئے کہ

بعد منزل نہ شود در سفر روحانی

- پھر وہ واقعہ یاد کیجئے کہ مولانا جلال الدین رومی کی ہی جائے پیدائش بلخ کے عظیم و جلیل شہنشاہ حضرت ابراہیم بن ادہمؒ نصف شب کو اپنے شاہی محل کی چھت پر کسی کے چلنے کی آہٹ سنتے ہیں۔ دریافت کرنے پر غیبی آواز نے کہا تھا کہ ”میں اپنا اونٹ ڈھونڈتا ہوں۔“ اس پر حضرت ادہمؒ

متعجب ہو کر بولے: ”چھت پر اور اونٹ؟“ جواب آیا: ”محل میں اور خدا؟“

پھر قارئین کو یہ حقیقت معلوم ہی ہے کہ دوسرے دن دربار میں کیا واقعہ پیش آیا¹۔ بس، ایک ذرا سا ٹھوکا دیا گیا اور دنیائے دل اٹھل پٹھل ہو گئی۔ اس کے بعد، بلخ کے یہی بادشاہ جن کے جلوس کے آگے اور پیچھے خدام سونے کی چالیس چالیس تلواریں اور اعصائے سلطنت لے کر چلتے تھے، تصوف میں اس طرح ڈوبے کہ دریائے فرات کے کنارے پھٹی پرانی گڈری سی رہے تھے۔ کسی نے طنزاً کہا کہ بلخ کی بادشاہت چھوڑ کر آپ کو کیا ملا۔ جواب میں آپ نے اپنی سوئی دریا میں ڈال دی۔ پھر فرمایا کہ میری سوئی واپس کر دے۔ معاً بے شمار مچھلیاں اپنے منہ میں سونے کی سوئی لئے ہوئے سطح آب پر آئیں۔ حضرت ابراہیم ادھمؒ نے فرمایا کہ یہ میری سوئی نہیں۔ مجھے تو لوہے والی اپنی سوئی چاہیے۔ چنانچہ ایک چھوٹی سی مچھلی پانی کی سطح پر نمودار ہوئی۔ اس کے منہ میں حضرت ابراہیمؒ کی سوئی تھی۔ یہ دیکھ کر آپ نے اس شخص سے فرمایا:

”یہ ہے میری بادشاہت!“

یہ بادشاہت بڑے سے بڑے عالم، بڑے سے بڑے فاضل، بڑے سے بڑے فلسفی، حتیٰ کہ بڑے سے بڑے سائنس داں کو بھی میسر نہیں ہوئی۔ اور جو ہوئی تو ایک درویش بے نوا اور ایک صوفی باصفا کو..... اس کی بین وجہ اللہ کا فرمان ہے:

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَافِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۝

یہ تسخیر کائنات انہی بوریائشینوں کے لئے ہے اور اس کی جھلک ہم مولانا نے روم کی اہلیہ کرا خاتون کے بیان کردہ واقعہ میں دیکھ چکے ہیں جب دیوار شق ہوئی، چھ نورانی پیکر در آئے اور پھولوں کا ایسا گلدستہ دیا بدتوں جس کی نہ رنگت زائل ہوئی، نہ خوشبو اڑی اور نہ تروتازگی ختم ہوئی۔

☆☆☆

مندرجہ بالا عبارتوں کے مطالعہ سے یہ بات قارئین پر واضح ہو گئی ہوگی کہ مولانا جلال الدین رومی سے قدرت کو جو ابدی نوعیت کا کام لینا تھا اور بنی نوع انسان کے دلوں کی جلا کے لئے ان کا جو کلام

1 تقدیم میں تفصیل درج کر دی گئی ہے۔

بلاغت نظام درکار تھا..... اس کے لیے مسند دانشوری نہیں، بوریائے بوذرچائیے تھا۔ اور یہ چیز گلیم پوش شمس الدین تبریزی نے فراہم کر دی، اور اس طرح کر دی کہ مولانا کا سراپا ہی بدل گیا۔ بقول علامہ شبلی نعمانی:

”مولانا جب تک تصوف کے دائرے میں نہیں آئے تھے، ان کی زندگی عالمانہ جاہ و جلال کی شان رکھتی تھی۔ ان کی سواری جب نکلتی تھی تو علماء اور طلباء، بلکہ امراء کا ایک بڑا گروہ رکاب میں ہوتا تھا۔ مناظرہ اور مجادلہ جو علماء کا عام طریقہ تھا، مولانا اس میں اوروں سے چند قدم آگے تھے۔ سلاطین اور امراء کے دربار سے بھی ان کو تعلق تھا۔ لیکن سلوک میں داخل ہونے کے بعد یہ حالت بدل گئی۔“

مولانا نے روم اپنے مرشد تبریزی کے اس طرح حلقہ بگوش بن گئے تھے کہ

من تن شدم تو جاں شدی
من جاں شدم تو تن شدی!

صرف جان و تن کا ہی معاملہ نہ تھا، آداب پیر کا پاس و لحاظ بھی تھا۔ اور راہ سلوک و معرفت میں آداب شیخ کی جو اہمیت ہے اُس جانب استاذی المحترم ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نقشبندی مرحوم نے یوں اشارہ کیا ہے:

”حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا ہے: اَدَّبْنِي رَبِّي وَ اَحْسَنَ تَسَادِيْنِي۔ یعنی ”میرے رب نے مجھے ادب سکھایا۔ پس مجھے بہت ہی اچھا ادب سکھایا۔“ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سالک کے لئے آداب کی رعایت لازمی ہے۔ کوئی بے ادب منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ (اے ایمان والو! اپنی آوازیں نبی کی آواز کے اوپر بلند نہ کرو اور ان سے اس طرح بے تکلفی کے ساتھ زور سے کلام مت کرو جس طرح ایک دوسرے سے زور سے بولتے ہو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔)

لہذا مرید کو چاہیے کہ پیر کا ادب رکھے اور ذکر کی جو تعلیم و تلقین پیر اس کو بتلا دے، اس کا

پابند رہے اور اس کی نسبت یوں اعتقاد رکھے کہ جو فائدہ مجھ کو اپنے پیر سے پہنچ سکتا ہے وہ کسی اور بزرگ سے نہیں پہنچ سکتا اور جو فیض مرید کو پہنچے اس کو پیر ہی کے ذریعہ سمجھے۔“

مولانا نے روم آداب شیخ کی اہمیت سے آگاہ تھے، لہذا تعلیمات تبریزی کی دل و جان سے پیروی کی۔ پیر کی ہر بات پر آمنا و صدقنا کہتے رہے۔ مرشد نے مولانا کو اپنے والد شیخ بہاء الدین ولد کی ان تصانیف کے مطالعہ سے منع کر دیا تھا جو ہمیشہ ان کو محبوب نظر رہیں۔ اسی طرح انہیں عربی زبان و ادب کے عظیم المرتبت شاعر الممتنی کی کتابیں پڑھنے سے بھی روک دیا تھا۔ مولانا بلاچوں و چرا اس حکم کی پابندی کرتے رہے۔

پھر، مولانا رومی کا کمرے میں بند ہو کر ذکر الہی میں مشغول ہونا، مجاہدے میں مصروف رہنا، پابندی وقت کے ساتھ نماز پڑھنا..... یہ ساری باتیں پیر طریقت تبریزی کی رہنمائی میں انجام پاتی رہیں۔ اس کا حاصل یہ ہوا کہ شمس نے انہیں روحانی قوت سے نوازا دیا اور اس طرح کہ کبھی جوان عورت طلب کی، کبھی نوخیز طفل کی خواہش کی اور کبھی شراب کی فرمائش کی۔ مولانا نے روم تمام آزمائشوں میں پورے اترے اور معرفت کا اعلیٰ ترین مقام حاصل کر گئے۔

جب کوئی صوفی اللہ کا ہو جاتا ہے تو اللہ بھی اس کا ہو جاتا ہے۔ پھر ولی جو چاہے طلب کر لے، جو آرزو ہو پوری کر لے، جو خواہش ہو بروئے کار لے آئے۔ دنیا اس کی مٹھی میں سما جاتی ہے، ارض و سما اس کے لیے مسخر ہو جاتے ہیں اور وقت کی طنائیں کھنچ جاتی ہیں۔ پھر یہ صورت ہوتی ہے کہ کرامتیں خود بخود ظہور پذیر ہوتی رہتی ہیں..... یہ خصوصیت اللہ لوگوں کی ہوتی ہے اور مولانا نے روم اس سے مبرانہ تھے۔ چند واقعات کے مطالعہ سے ہی یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ وہ منتہائے تصوف تک پہنچ چکے تھے:

• ہلاکو خاں کے سپہ سالار باجو خان نے قونیہ پر حملے کا ارادہ کیا اور شہر کے چاروں اطراف میں اپنی فوجیں پھیلا دیں۔ اہل قونیہ مولانا نے روم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور محاصرے کی وجہ سے پریشانی کا اظہار کیا۔ آپ نے ایک ٹیلے پر جو باجو خان کے خیمے کے عین سامنے تھا، جا کر نماز پچھا دی اور نماز پڑھنی شروع کر دی۔ سپاہیوں نے مولانا پر تیر برسانا چاہا۔ ان کی کمائیں کھنچ نہیں سکیں۔ ناچار ان کی طرف گھوڑے بڑھائے کہ قتل کر دیں، مگر گھوڑے اڑے رہے، آگے نہ بڑھ سکے۔

باچو خان خیمے میں تھا۔ اسے خبر دی گئی۔ وہ خیمے سے نکلا اور کئی تیر چلائے مگر سب ادھر ادھر نکل گئے۔ آخر وہ مولانا کی طرف پیدل چلا کہ جا کر کام تمام کر دے، لیکن پاؤں سوسومن کے وزنی ہو گئے۔ آخر محاصرہ ختم کر کے واپس چلا گیا اور قونیہ کے لوگ اس کی غارت گری سے محفوظ رہے۔

کسی مجلس میں لوگ بڑی بڑی اور وزنی قسم کی موم بتیاں لے کر آئے۔ مولانا جلال الدین رومی بھی وہاں ایک ننھی منی سی موم بتی لیے ہوئے وارد ہوئے۔ لوگ ان کی معمولی سی موم بتی دیکھ کر تمسخرانہ انداز میں ہنسے۔ اس پر آپ نے ان لوگوں سے کہا کہ اُن کی موم بتیاں اس ننھی منی موم بتی کی بدولت ہی روشن ہیں۔ وہ اس بات پر قہقہہ لگانے لگے۔ تب، جلال الدین رومی مسکرائے، چاروں طرف دیکھا اور پھر پھونک مار کر اپنی چھوٹی سی موم بتی بجھا دی۔ آنا فانا ساری موٹی موٹی اور وزنی موم بتیاں بجھ گئیں اور پوری مجلس میں اندھیرا چھا گیا۔ چند ثانیے کے بعد آپ نے اپنی موم بتی جلائی۔ اس کا جلانا تھا کہ تمام لوگوں کی موم بتیاں روشن ہو گئیں۔

ایک مرتبہ مولانا نے روم کے ایک مرید نے مصر کے سفر پر جانے کا ارادہ کیا۔ اس کے دوستوں نے منع کیا، مگر وہ نہ مانا۔ یہ بات مولانا نے روم کے علم میں لائی گئی۔ آپ نے بھی اسے سفر پر جانے سے منع فرمایا۔ مگر وہ مرید اپنی خواہش کو دبانہ سکا اور ایک رات چپکے سے شام کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب وہ انطاکیہ پہنچا تو ایک جہاز کے عملے میں شامل ہو گیا۔ پھر جہاز چل پڑا۔ اس کی بد قسمتی کہیے کہ جہاز کو قزاقوں نے گھیر لیا اور اس پر قبضہ کر لیا۔ مذکورہ مرید کو قیدی بنا دیا گیا اور اسے تہہ خانے میں ڈال دیا گیا۔ اس کو وہاں اتنی کم خوراک دی جاتی تھی کہ اس کا زندہ رہنا دشوار ہو گیا۔

یہ مرید زار و قطار رونے لگا اور مرشد رومی کے حکم کی خلاف ورزی کرنے پر اپنے آپ کو لعنت ملامت بھی کرنے لگا۔ چالیس کرب ناک ایام کے بعد ایک رات مولانا جلال الدین رومی اس کے خواب میں آئے اور فرمانے لگے: ”کل چند کافر لوگ آئیں گے اور تجھ سے متعدد سوالات پوچھیں گے۔ ان کے ہر سوال کے جواب میں کہنا: ”میں جانتا ہوں۔“ اس طرح وہ تجھے آزاد کر دیں گے۔“

اگلے دن صبح چند فرنگی لوگ اس کے پاس آئے اور کہنے لگے: ”ہمارا شہزادہ بیمار ہے۔“ یہ مرید بولا

”ہاں مجھے علم ہے۔“ انہوں نے کہا: ”وہ یقیناً مر جائے گا۔“ مرید نے جواب دیا: ”میں جانتا ہوں۔“ پھر انہوں نے پوچھا: ”کیا تمہیں علاج معالجے کے بارے میں علم ہے؟“ مرید نے کہا کہ ”ہاں میں جانتا ہوں۔“

ان لوگوں نے اسے تہہ خانے سے نکالا، اسے نہلایا دھلایا، اسے عمدہ پوشاک پہنائی اور اپنے بیمار شہزادے کے کمرے میں لے گئے۔ خدا نے اس مرید میں یہ بات ڈال دی کہ وہ کافروں کو سات قسم کے پھل لانے کے لئے کہے۔ پھر اس نے ان پھلوں میں کچھ جڑی بوٹیاں ملا کر دو ابنائی اور بیمار شہزادے کو کہا کہ وہ اسے پی لے۔

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اس کا علاج تیر بہدف ثابت ہوا اور شہزادہ رو بہ صحت ہو گیا۔ اس نے کہا کہ جو خواہش ہو بتاؤ۔ مرید نے آزادی کی تمنا ظاہر کی۔ وہ اس طرح گھر واپس آ گیا اور مولانا نے روم کے قدموں میں گر کر پھوٹ پھوٹ کر رویا۔

مولانا رومی کے انتقال کے بعد مغل سپہ سالار کتو خاں اپنی فوج ظفر موج لے کر قونیہ آ گیا تاکہ شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دے اور یہاں کے باشندوں کو تہ تیغ کر دے۔ اسی رات خان نے خواب میں دیکھا کہ مولانا رومی اس کے پاس آئے ہیں اور اس کا گلا دبا کر کہنے لگے: ”قونیہ میرا ہے۔ تمہارا میرے لوگوں سے کیا کام؟“

جب وہ جاگا تو دوزانو ہو کر معافی مانگی اور دوسرے دن اس نے قونیہ کے حکمراں کے پاس اپنا قاصد بھیجا اور بہ حیثیت مہمان اندرون شہر داخل ہونے کی درخواست کی۔ حاکم قونیہ کو سخت حیرت بھی ہوئی کہ کہاں وہ ہمارے ملک پر یورش کرنے اور لوگوں کو ہلاک کرنے کی نیت سے آیا تھا اور کہاں یہ التجا! بہر حال، قاصد سے کہلوادیا گیا کہ ہم بخوشی دل آپ کا استقبال کریں گے۔

جب مغل سپہ سالار آیا تو حاکم قونیہ اور عمائدین شہر نے آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا اور بے شمار زرو جواہر نذر کئے۔ جونہی وہ سپہ سالار ایک مرصع کرسی پر بیٹھا تو اپنے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھے ہوئے حاکم قونیہ سے کہا:

”تمہارے ساتھ والی کرسی پر کون بیٹھا ہے؟“ یہ کہہ کر وہ مارے خوف کے لرزنے لگا۔

اس کی یہ بات سن کر حاکم قونیہ نے کہا:

”اے خان اعظم! میرے ساتھ کوئی بھی تو نہیں ہے۔ آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟“

”میں تمہارے ہی پاس ایک کرسی پر ایک شخص کو بیٹھا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ وہ لائے قد کا ہے۔ اس کے چہرے پر داڑھی ہے۔ سر پر سبز رنگ کی پگڑی پہنے ہوئے ہے۔ اس کا جسم اونچی چارخانے کی چادر سے ڈھکا ہوا ہے..... اور وہ مجھے نہایت خشمگیں نظر سے گھور رہا ہے۔“ یہ کہہ کر مغل فوج کا سالار اعظم تھر تھر کانپنے لگا۔

”اوہ! خان اعظم! یہ تو ہمارے معزز و محترم مولانا جلال الدین رومی ہیں۔ یہ اسی علاقے میں مدفون ہیں۔“

خان اعظم نے کانپتی ہوئی آواز سے کہا:

”اے حاکم قونیہ! میں نے رات خواب میں اسی حلیے اور رنگ روپ کے آدمی کو اسی لباس میں دیکھا تھا۔ وہ میرا گلا دباتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ قونیہ میرا ہے۔ تمہارا یہاں کیا کام..... اب میں یہاں سے فوراً جا رہا ہوں۔ قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہاں سے پتھر کا ایک ٹکڑا اور مٹی کا ایک ڈھیلا بھی نہیں لے جاؤں گا۔“

اسی آن مغلوں کی فوج ظفر موج قونیہ کا محاصرہ اٹھا کر واپس لوٹ گئی۔¹

1 تاریخ گرامی! یہ اللہ لوگ بڑی روحانی قوتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ یہ خدا تعالیٰ کی رضا کے تحت اور جذبہ ایمانی کے جلو میں جو کارہائے نمایاں انجام دیتے ہیں اس کا اشارہ علامہ اقبال کے اس شعر میں بخوبی مل جاتا ہے:

دشت تو دشت دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحر ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

قونیہ کا مذکورہ واقعہ 1260ء کی آخری دہائی میں پیش آیا تھا۔ اس کے ٹھیک ایک سو سال بعد اسی نوع کا واقعہ ہندوستان کے دارالخلافہ دہلی میں پیش آیا تھا۔ وہ زمانہ علاء الدین خلجی کا تھا۔ اور اسی زمانے میں سلسلہ چشتیہ کے ممتاز رکن اور بابا صاحب پاک پتن کے خلیفہ حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء اپنی خانقاہ میں موجود تھے۔ ایک روز بادشاہ کے بھیجے ہوئے تین آدمی آپ کے پاس اس کا پیغام لے کر آئے۔ ان میں حضرت کے مرید امیر خسرو بھی تھے جو دربار خلجی سے وابستہ تھے۔ بادشاہ نے یہ کہلوا یا تھا کہ طفعل مغل اپنی فوج لے کر دہلی آ پہنچا ہے اور اس شہر اور یہاں کے لوگوں کو خاکستر کر دینے والا ہے۔ بادشاہ کی زیادہ تر فوج حیدرآباد دکن کی یورش دبانے کے لیے وہاں گئی ہوئی ہے۔ دارالخلافہ میں بہت تھوڑے سے فوجی موجود ہیں جو طفعل کی فوج ظفر موج کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ اب دعا کا وقت ہے اور اس کی التجا آپ ہی سے ہے۔ حضرت محبوب الہی نے یہ پیغام سنا، کچھ دیر توقف کیا پھر فرمانے لگے کہ بادشاہ سے کہہ دو کہ طفعل مغل کل فوج لے کر واپس چلا جائے گا۔ چنانچہ خلجی کا وفد واپس چلا گیا۔ (بقیہ فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر ملاحظہ کیجیے)

یہ شمس تبریزی تھے جنہوں نے مولانا نے روم کی کایا پلٹ دی تھی اور کچھ اس طرح کہ خود ان کے ساتھ رعونت آمیز انداز میں پیش آنے والے جلال الدین سراپا فقیر بن گئے تھے۔ ریاضت اور مجاہدے میں ہمہ تن مصروف رہتے۔ مسلسل روزہ رکھنے لگے تھے اور اس طرح کہ دس دس بیس بیس دن کچھ نہ کھاتے تھے۔ نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو چہرے کا رنگ مارے خوف الہی کے متغیر ہو جاتا۔ رات کے ابتدائی حصے میں نیت باندھتے اور دو رکعت ہی میں فجر کا وقت آن پہنچتا۔ شب خوابی کے لباس سے بے نیاز، بستر اور تکیے سے بے نیاز، نیند سے بے نیاز اور آرام سے بے نیاز ہو چکے تھے۔ اگر نیند کی شدت ہوتی تو دوزانو ہو کر تھوڑی نیند لے لیتے..... پھر وہی ریاضت شاقہ!..... وہ اس طرح اپنے رب کے حضور کھڑے ہوتے کہ سارا بدن تھر تھر کانپنے لگتا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔

کوچہ تصوف میں قدم رکھنے کے بعد مولانا جلال الدین رومی کی ہیئت جس طرح تبدیل ہوئی تھی اور ان میں درویشی کی خاصیت جس طرح پیدا ہو گئی تھی، اس کا اندازہ مندرجہ ذیل واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے۔

(بقیہ فٹ نوٹ کچھ صفحے کا)

کچھ ہی لمحے بعد آپ کھڑے ہو گئے۔ پھر بیٹھ گئے۔ پھر کھڑے ہوئے اور بیٹھ گئے۔ حاضرین میں سے کسی نے اس کا سبب پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ بادشاہ کا پیغام سننے کے بعد میں نے اپنے پیر بابا فرید کی طرف توجہ کی اور نہایت اعتماد سے طغرل کی واپسی کا مزدہ سنا دیا۔ پھر میں نے اجودھن کا کتا دیکھا۔ میں اس کے احترام میں کھڑا ہو گیا۔ وہ تین مرتبہ آیا اور میں بھی اس کے احترام میں تین بار کھڑا ہوا۔ مجھے بشارت مل گئی کہ مغل فوجی کتے ہیں، چلے جائیں گے۔ اس کے بعد آپ نے مجلس میں موجود اپنے ایک مغل مرید کو قریب بلا کر فرمایا کہ میرا یہ رومال لے کر طغرل کے پاس چلا جا۔ اسے میری طرف سے سلام کرنا اور کہنا کہ یہ رومال چہرے پر رکھے، پھر جو کچھ نظر آئے وہ بتائے۔ چنانچہ مغل مرید رومال لے کر روانہ ہوا۔ راستے میں اسے کسی نے بھی نہیں روکا۔ وہ مغل فوجیوں کے درمیان سے گزرتا ہوا طغرل تک پہنچ گیا اور اسے رومال دیا۔ اس نے منہ پر رکھ لیا۔ کافی دیر رکھنے کے بعد، جب ہٹایا تو اس کا چہرہ خاصا پریشان لگ رہا تھا۔ اس نے برجستہ کہا:

”میں حضرت محبوب الہی کا ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے دلی میں بیٹھے بیٹھے میرے ملک کی سیر کرا دی۔ میرا ایک دشمن فوج لے کر میرے دار الخلافہ کی طرف بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ میری رعایا مجھے پکار رہی ہے اور اجودھن سے حضرت بابا فرید گنج شکر حکم دے رہے ہیں کہ طغرل واپس چلا جا۔ طغرل واپس چلا جا۔ اب میں اپنا محاصرہ اٹھا کر واپس اپنے ملک جا رہا ہوں۔ اور یہ رومال ایک تبرک سمجھ کر لیے جا رہا ہوں۔“

دوسرے دن صبح ہی صبح دلی میں یہ خبر گشت کر رہی تھی کہ طغرل مغل کی فوج واپس جا رہی ہے۔ حضرت محبوب الہی خواجہ نظام الدین اولیاء کی دعا مستجاب ہو چکی تھی۔ (ملاحظہ ہو ”نظامی بنسری“ مطبوعہ دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد)

قونیہ کی ایک شاہراہ پر دو شخص گالم گلوچ میں مصروف تھے۔ ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا:

”اوعین! تو ایک کہے گا تو مجھ سے دس سنے گا۔“

اتفاق سے مولانا نے روم اس راستے سے گزرے۔ آپ نے اس شخص سے کہا کہ ”اے برادر!

تمہیں جو کچھ کہنا ہے، جو گالی دینی ہے، جو لعن طعن کرنا ہے، جو کچھ کو سنا ہے، مجھ کو مخاطب کر کے کہہ لو۔ مجھ

کو تم ہزار صلوة سناؤ گے تو بدلے میں ایک بھی نہ سنو گے۔“

ہزار صلوة سننے کے بعد بدلے میں ایک جملہ بھی نہ کہنے والا صوفی باصفا اور ولی کامل نہ ہوگا تو

دوستو، وہ پھر کیا ہوگا؟ اور مندرجہ ذیل نظریے کے حامل شاعر کو ہم کیا کہیں گے؟

اے خنک جانے کہ عیب خویش دید

(قابل تعریف ہے وہ شخص جو اپنا عیب دیکھے)

ہر کہ عیبے گفت آن بر خود گزید

(جو کوئی عیب بتائے، اپنے لئے تسلیم کر لے)

زانکہ نیے او ز عیبتان بدست

(کیونکہ اس کا آدھا عیبوں کی دنیا کا ہے)

وان دگر از روئے ز عیبتان بدست

(دوسرا (آدھا) عالم غیب کا ہے)

چونکہ بر سر مر ترا صد ریش ہست

(چونکہ تیرے سر پر سو زخم ہیں)

مر ہمیش بر خویش باید کار بست

(ان کا مرہم اپنے اوپر لگانا چاہیے)

عیب کردن ریش را داروے اوست

(زخم کو برا سمجھنا ہی اس کا علاج ہے)

چون شکستہ گشت جائے ارحمو است

(جب خاکسار بن گیا ارحمو کا حامل ٹھہرا)

لا تتخافوا من خدا نشیدہ¹

(تو نے تو خدا سے لا تتخافوا نہیں سنا ہے)

پس چہ خود را ایمین و خوشدیدہ

(پھر اپنے آپ کو کیوں مطمئن اور اچھا سمجھتا ہے)

اور یہ صوفیائے کرام نہ کبھی مطمئن ہوئے اور نہ اپنے آپ کو اچھا سمجھا۔ مولانا جلال الدین رومی بھی ان ہی میں ایک تھے۔ ان ہی اوصافِ ولی اللہی کا نتیجہ تھا کہ جب مولانا نے روم کا جسدِ خاکی تدفین کے لئے اس جگہ لایا گیا جہاں آپ کے والد ابدی نیند سو رہے تھے تو اپنے ہی بلند مرتبت صوفی بیٹے کے استقبال کے لیے آپ اپنی قبر سے باہر آ گئے۔ ممکن ہے قارئین کو اس واقعہ پر اعتبار نہ آئے اور اسے ذہنی اختراع اور عقیدت کیشی کا ایک ڈھونگ سمجھ لیا جائے..... مگر قونیہ کا ہر باشندہ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہے اور اسے مولانا نے روم کا ایک معجزہ سمجھتا ہے..... ٹھیک اسی طرح جب آپ نے حملہ آور مغل سردار کتھو خاں کا گلا دبا یا تھا، حالانکہ مولوی معنوی کے انتقال کو عرصہ ہو گیا تھا۔

1 قرآن مجید میں اللہ کے کامل اور مومن بندوں کے لیے آیت آئی ہے۔ لَا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا۔ اللہ رب العزت نے کامل مومنوں سے یہ بات کہی ہے۔ مولانا رومی کا خطاب عام مسلمانوں سے ہے۔

بہ حیثیت شاعرِ ہمہ رنگ

اردو کے نامور غزل گو ڈاکٹر عندلیب شادانی کا ایک شعر ہے ۔

دل پر چوٹ پڑی ہے تب تو آہ لبوں تک آئی ہے
یوں ہی چھن سے بول اٹھنا شیشے کا دستور نہیں

اگر ہم اس شعر کو حیاتِ رومی پر منطبق کریں تو صداقت سامنے آجائے گی۔ طالب علمی کے کسی موڑ پر انہوں نے شعر نہیں کہا، جوانی میں بھی سخن سنجی سے دور رہے، حتیٰ کہ تعلیم و تدریس کے دوران بھی، جب وہ ادب کے متنوع پہلوؤں پر روشنی ڈالتے تھے، شعر گوئی سے انہیں سراسر اجتناب رہا۔ بات دراصل یہ تھی کہ دلِ رومی پر کوئی چوٹ نہیں پڑی تھی، اسے کوئی دھچکا نہیں لگا تھا، کسی قسم کی آنج نہیں آئی تھی۔ وہ ان تمام آلام سے مبرا تھے۔ انہیں دنیاوی جاہ و حشمت حاصل تھی۔ عزت و تعظیم میسر تھی۔ کرا خاتون جیسی خوبصورت عورت رفیقہ حیات تھیں۔ دو معصوم اور خوبصورت بیٹے اللہ نے دے رکھے تھے۔ عہدہ داعزاز تھا۔

یہ سارے لوازمات سخن سنجی کے لیے متحرک ثابت نہیں ہوتے اور ذوقِ شعر گوئی کو ہمیںز بھی نہیں کرتے۔ بھرتی کے شعر کہنا ہر ہاشما کا کام ہے۔ لیکن دل پر چوٹ لگانے والے اشعار..... یہ تو عطار و

حافظ، انوری و خاقانی اور خیام و خسرو کا عطیہ بے بہا ہے۔ اور ان ہی میں مولانا نے روم بھی شامل ہیں۔
مگر کس طرح اور کیوں کر؟

وہ ایک فقیر بے ریا تھا، وہ ایک درویش خدا مست تھا اور وہ ولی با صفا تھا جس کے عشق میں مولانا نے مسند نشیں گرفتار ہوئے۔ جس کی محبت کی چنگاری نے ان کے تن بدن میں آگ لگا دی۔ جس کی الفت کے شعلوں نے جامہ حریر و پُرنیاں اور دستارِ فخر و امتیاز کو جلا کر بھسم کر دیا..... اور جب یہ مرکز عشق و محبت نگاہوں سے اوجھل ہو گیا، جب یہ محورِ شوق و ولولہ نظرِ رومی سے روپوش ہو گیا، جب معشوقِ جلال داغِ مفارقت دے گیا اور وسیع و عریض کائنات میں گم ہو گیا..... پھر مولوی معنوی کے دل پر چوٹ پڑی اور..... آہ و فغاں اشعار بن بن کر لبِ رومی پر رقص کناں ہو گئے۔

اس میں ذرا بھی کلام نہیں کہ قدرت نے ان کے خمیر میں سخنِ سنجی اور شعر گوئی کی صلاحیت پیوست کر دی تھی، مگر یہ عطیہ خداوندی ایک طویل عرصے تک جلال الدین رومی کے نہاں خانہ دل اور احاطہ ذہن میں مخفی رہا۔ اسے ابھر کر منصفہ شہود پر جلوہ گر ہونے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ یعنی صلاحیتِ شعر گوئی موجود تھی، مگر..... اسے ”چوٹ“ لگ کر نمایاں ہونے کا لمحہ میسر نہیں ہوا تھا۔

بلاریب، یہ شمس تھے جو سخنِ سنجی رومی کے محرک بنے۔ بہ فرض، وہ نہ ہوتے اور شاعری کی ودیعت شدہ صفت کبھی نہ کبھی جان و تن رومی میں انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھتی تو وہ شاعر بن جاتے، ہزاروں شاعروں کی طرح! مگر انہیں ”دیوان شمس تبریز“ کے خالق کے طور پر اور ”مثنوی معنوی“ کے عظیم المرتبت شاعر کی حیثیت سے وہ مقام ہرگز، ہرگز حاصل نہ ہوتا، جو گمشدگیِ معشوق کی بدولت حاصل ہوا۔ یہ کوئی ”جنسی عشق“ نہ تھا، یہ چاند میں نظر آنے والی میر تقی میر کی معشوقہ کا عشق نہ تھا، یہ غالب کی ”جھرو کے والی“ کا عشق نہ تھا، یہ مصحفی کی ”مصحفن“ والا عشق نہ تھا..... مولانا رومی کا یہ عشق، عشقِ مجازی نہیں، عشقِ حقیقی تھا۔ اور شمس تبریز ایک وسیلہ تھے اللہ جَمیل تک پہنچنے کا۔ وہ ہاتھ میں معرفت کا چپولے اس کشتی کو کھے رہے تھے جو رومی کا مقدر بن چکی تھی اور جس کی منزل..... قرب الہی تھی! قدرتِ خداوندی نے شمس الدین تبریزی کو ایک وسیلہ بنایا تھا، ہزار ہا پیرانِ طریقت کی مانند اور جب دلِ رومی میں عشق کی آگ بھڑک اٹھی تو وہ چپکے سے کھسک گئے۔ ان کا مقصد قونیہ میں مستقلاً قیام تھا ہی نہیں۔ وہ تو اپنے مرشد طریقت، بابا کمال الدین جندی کی واضح ہدایت پر دلِ رومی کو سوختہ کرنے آئے تھے۔ سو،

شعلہ عشق بھڑکایا اور چلتے بنے۔

اگر ہم تصوف کی تاریخ کا بہ نظر غائر مطالعہ کریں تو ایسی مثالیں ان گنت ملیں گی۔ مخدوم الملک شیخ شرف الدین منیری (مکتوبات صدی، مکتوبات دو صدی کے مصنف) پیر کی تلاش میں بہار شریف سے نکلے اور پورے ہندوستان کی خاک چھانتے ہوئے دلی پہنچے۔ حضرت خواجہ محبوب الہی نظام الدین اولیاء کی مجلس میں حاضر ہوئے۔ آپ نے مخدوم کو دیکھ کر فرمایا:

”سیرغ است، ولے نصیب دام مانیت“

جناب مخدوم نے حضرت غوث علی شاہ قلندر پانی پتی سے جا کر ملاقات کی۔ آپ کو دیکھتے ہی

قطب وقت نے کہا:

”شیخ است۔ اما مغلوب الحال است۔

تربیت دیگرے نمی پروازد۔“

وہاں سے بھی محروم ہو کر مخدوم شرف الدین منیری شیخ نجیب الدین فردوسی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ کہنے لگے کہ ”کب سے تمہاری امانت کی حفاظت کر رہا ہوں۔“ پھر بیعت لے کر فوراً نہیں واپس کر دیا۔ ساتھ ہی یہ حکم دیا کہ راستے میں کوئی اہم خبر ملے تو ہرگز واپس نہ لوٹنا۔ مخدوم شرف الدین ابھی راستے ہی میں تھے کہ مرشد کے انتقال کی خبر ملی۔ حکم تھا، لہذا واپس نہ لوٹے۔ اور آہ و بکا کرتے ہوئے گھنے جنگل میں بارہ سال کے لئے گم ہو گئے۔

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد

روئے گل سیر نہ دیدیم و بہار آخر شد

اور جب ریاضت شاقہ کے بعد نکلے تو کندن بن چکے تھے۔

یہی حال ہمارے مولانا رومی کا ہوا۔ اہل قونیہ کا اذیت ناک رویہ شمس تبریز کے لئے محض ایک

بہانہ تھا۔ اگر یہ واردات نہ بھی ہوتی تو انہیں تبریز واپس جانا ہی تھا۔ اور اگر نہ جاتے تو پھر دنیائے ادب

مولانا نے روم جیسے عظیم شاعر سے ابد لآباد تک کے لئے محروم رہتی۔

جیسا کہ شروع میں کہا گیا، دل رومی پر چوٹ پڑنے سے سخن سنجی کے پوشیدہ تار ایک دم جھنجھنا اٹھے۔ پیر کی جدائی کی بنا پر مولانا کے دل میں جذبات کی آگ بھڑک اٹھی۔ اسی جذبے نے ان کے دل میں شاعری کا ولولہ پیدا کر دیا۔ اپنے محبوب صادق کے فراق میں ماہی بے آب کی طرح تڑپ تڑپ کر مولانا نے روم اشعار کہنے لگے..... نہایت ولولہ انگیز، حد درجہ درد آمیز، بے حد مسحور کن اور بے انتہا رقت خیز! قبل اس کے کہ ہم باب ہذا کے عنوان کے تحت مولانا جلال الدین رومی کی ہمہ رنگ شاعری کا ناقدانہ جائزہ لیں، ایک غلط نظریے کی وضاحت اور اس کا سدباب ضروری سمجھتے ہیں۔

مولانا رومی کی شخصیت اور شاعری کے حوالے سے کتابیں لکھنے والے مصنفین نے آر۔ اے۔ نکلسن کے اس نظریے کو آتنا و صدقاً کہا کہ قبول کر لیا ہے کہ جب شمس تبریزی کے خلاف ایک شورش پیدا ہوئی اور نیاز مندانِ رومی نو وارد درویش سے بے حد کبیدہ خاطر ہو گئے تو مولانا نے روم گڑ گڑا گڑ گڑا کر، آنسو بہا بہا کر، دل کو موسوس کر کر کے اس نوع کے ”طفلانہ“¹ شعرا اپنے مرشد کے روبرو کہنے لگے:

بشنیدہ ام کہ عزم سفر میکنی مکن
مہر حریف و یار دگر میکنی مکن
تو در جهان غریبی و غربت ندیدہ
قصد کدام خستہ جگر میکنی مکن
ای مہ کہ چرخ زیر و زبر برای تست
ما را خراب و زیر و زبر میکنی مکن

(میں نے سنا ہے کہ آپ عازم سفر ہونے والے ہیں۔ یعنی آپ ایک نئے شخص کو مرکزِ محبت بنانے والے ہیں، اگرچہ اس دنیا میں آپ کی ذات باعثِ حیرت و استعجاب ہے لیکن آپ نے کبھی کشیدگی اور رنجش نہیں دیکھی۔ پھر آپ دل کو لرزہ بر اندام کر دینے والا طرزِ عمل کیوں اختیار کر رہے ہیں۔ اے مہتاب! یہ آسمان آپ ہی کو دیکھ دیکھ کر..... حیران و ششدر ہے۔

1 یہ اصطلاح علامہ شبلی کی ہے۔

پھر مجھے بھی اپنے فراق کے احساس سے آپ حیران و ششدر کیوں بنانا چاہتے ہیں۔

ان اشعار کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حجرہ تصوف میں، جہاں پیرو مرشد، عاشق و معشوق اور محبت و محبوب ہمہ وقت ذکر الہی میں مصروف رہتے اور معرفت کی منزلیں طے کرتے رہتے، وہاں شعر و شاعری کا ذکر بھی رہتا تھا اور رومی رو رو کر پیر سے رخت سفر نہ باندھنے کی التجا کرتے رہتے..... حیرت کی بات یہ ہے کہ نکلسن کی اس بات کو بہتیرے رومی شناس مصنفوں نے تسلیم کر کے مولانا کے روم کے منہ کو فراق تبریزی سے قبل ہی شعر و سخن کی لذت سے آشنا کر دیا ہے۔ حالانکہ بات ایسی نہ تھی۔

نکلسن جو فقط مترجم رومی ہیں، سے ہم اپنی توجہ ہٹا کر جب موجودہ دور کی ایک نامور محقق کی جانب رجوع کرتے ہیں تو معاملہ اس کے برعکس نظر آتا ہے۔ اور یہ جرمن نژاد خاتون ڈاکٹر این میری شیمیل ہیں جو پورے چالیس سال تک مطالعہ رومی اور تحقیق رومی میں غرق رہیں، بر ملا یہ کہتی ہیں:

”شمس تبریز کی پہلی گمشدگی کے نتیجے میں ہی مولانا کے روم فن سخن کی طرف متوجہ ہوئے۔ وہ

شاعر بن گئے، موسیقی سننے لگے، رقص کرنے لگے اور گانا گانے لگے۔“

اس نکتے کی وضاحت علامہ شبلی نعمانی نے بھی کی ہے۔ ان کی گراں قدر تصنیف ”شعر العجم“ ہی

اس بات کی ضامن ہے کہ وہ مولانا کے روم پر اوروں کی بہ نسبت زیادہ وسیع رائے کا اظہار کرتے تھے۔ ان کا کہنا ہے:

”شمس سے ملاقات سے پہلے مولانا کے شاعرانہ جذبات اسی طرح ان کی طبیعت میں پنہاں

تھے جس طرح پتھر میں آگ ہوتی ہے۔ شمس کی جدائی گویا چقماق تھی اور شرارے ان کی

پُر جوش غزلیں۔“

قارئین! آپ خود فیصلہ کر لیں کہ نکلسن کے منقول اشعار رومی کہ ”اے میرے مرشد! آپ

مجھے چھوڑ کر نہ جائیے۔“ طفلانہ ہی نہیں، غیر منطقی، غیر نفسیاتی اور غیر تاریخی بھی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ

رومی کی شعر گوئی کے پتھر پر فراق تبریزی ہی چقماق بن کر گرا تھا نہ کہ ان کے قونیہ سے جانے کی اثراتی

پڑتی اور غیر یقینی خبر! واضح رہے کہ شمس کچھ کہے بغیر، مطلع کئے بغیر ہی چلے گئے تھے..... آنا فانا! اور مرید و

محبت رومی کو ان کے غائب ہو جانے کا کچھ اس درجہ صدمہ ہوا کہ فراق محبوب میں نغمے الا اپنے لگے۔ اور

مذکورہ بالا اشعار ”دیوان“ میں مندرج ایک غزل کے ہیں جو یقیناً گمشدگی تبریز کے بعد طوفان آمدِ شعر کے نتیجے میں کہے گئے ہیں۔

بہر حال، شمس تبریزی رخصت ہو گئے اور مولانا رومی فراقِ محبوب میں شاعر بن گئے، ایسے کہ آٹھ سو سال گزرنے کے بعد بھی ان کا کوئی نعم البدل بساطِ عالم پر ہویدا نہیں ہوا۔ فراقِ یار کا یہ وہ دور ہے جب رومی کے اولین اشعار صفحہ قرطاس پر رقم ہونے لگے اور ”دیوان شمس تبریز“ کے گل بوٹے سجنے لگے۔ ابتدائی لمحات میں موزوں کردہ اشعار جس نوعیت کے تھے، اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اشعار سے لگایا جاسکتا ہے۔ یہ سارا کلام اپنے محبوب مرشد کی جدائی میں مولانا نے موزوں کیے تھے جو پھیلتے پھیلتے تیس ہزار اشعار پر مشتمل ہوئے اور ”دیوان شمس تبریز“ کی زینت بنے۔

بروید ای حریفان بکشید یار مارا
بمن آورید حالا، صنم گریز پارا
اگر او بہ وعدہ گوید کہ دم دگر ببايد
مخورید مکر او را بفرید او شمارا
بہ بہانہ ہائے شیرین بہ ترانہ ہائے موزون
بکشید کوئے خانہ مہ خوب خوش لقارا

(اے دوستو! جاؤ اور اصرار کر کے میرے محبوب کو لے آؤ۔ تم لوگ فی الفور چلے جاؤ اور میرے حیلہ جو معشوق کو ساتھ لیے ہوئے آ جاؤ۔ اگر وہ اس قسم کا وعدہ کرے کہ بعد میں کسی وقت آ جائے گا تو تم لوگ اس مغالطے میں ہرگز مت پڑنا اور نہ ہی اس کے فریب میں آ جانا۔ اے دوستو! جاؤ اور اس مرکزِ حسن و جمال کو میرے کلبہ تارک میں لے آؤ۔ ہاں، اس سے درخواست نہایت لجاجت سے کرنا اور نہایت متانت آمیز انداز و بیان اختیار کرنا۔)

قارئین! ذرا توقف کر کے صفحہ 82 پر نکلسن کے منقولہ اشعار کو دیکھئے اور مذکورہ بالا تین اشعار پر نظر ڈالئے۔ آپ خود اندازہ کر لیں گے کہ کذب و افترا کیا ہے اور حق و صداقت کیا ہے۔ محولہ بالا

1 میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ یہ اشعار رومی کے نہیں ہیں۔ رومی کے ہی ہیں، مگر یہ کہنا کہ شمس تبریز کو مخاطب کر کے سنایا گیا، سراسر غلط ہے۔ مولانا کی شعر گوئی کی ساری کڑیاں ہی اہل جاتی ہیں۔

غزلیہ اشعار ہی اُس شاعر کی شاعری کا حسین آغاز کر رہے ہیں جس نے تمام دنیا کی شاعری میں اپنے خاص تیور، منفرد انداز اور اثر انگیز لہجے سے ارفع و اعلیٰ مقام بنا لیا ہے۔ یہاں رومی بظاہر تو مجازی عاشق نظر آ رہے ہیں، مگر در پردہ وہ عشقِ حقیقی کی جلوہ سامانیوں کو نہایت جذب و انہماک کے ساتھ یوں پیش کر رہے ہیں کہ قاری خود اپنے دل کو سنبھال نہیں پاتا۔

غزل جس کا خمیر ہی عشق و محبت کے مسالے سے گوندھا گیا ہے اور جس کے انداز بیان میں حرماں نصیب عاشق کی تڑپ اور اضطراب بخوبی عیاں ہو جاتا ہے..... مولانا رومی کے یہاں اپنی جملہ رعنائیوں کے ساتھ انگڑائی لیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ہر مصرع، فراق یار کی ترجمانی کرتا دکھائی دیتا ہے اور ہر شعر عاشقِ مجبور کی بے تابی کی جلوہ کشی کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے، رومی نے صفحہ قرطاس پر اپنا تڑپتا ہوا کلیجہ نکال کر رکھ دیا ہے۔

”دیوان شمس تبریز“ صحیح معنوں میں غزلیات کا سبد گل ہے۔ جو حضرات صنفِ غزل کے حسن، لطافت، پاکیزگی، اثر انگیزی اور دل کو جھنجھوڑنے والے اوصاف سے بخوبی آشنا ہیں، وہ اس دیوان کو فارسی ادب کا طرہ امتیاز قرار دینے پر ہر طرح آمادہ نظر آتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ مولانا رومی نے جو شعر بھی موزوں کیا ہے، وہ دل کی اتھاہ گہرائیوں سے اُبل کر ہی سامنے آیا ہے۔ اس میں سفلی جذبات کی نہ کوئی آمیزش ہے اور نہ ہی حیوانی جبلت کی عکاسی!..... یہ پورا مجموعہ کلام عاشقِ صادق کے روح پرور جذبات کا آئینہ دار ہے اور اس میں انسانیت کا آفاقی رنگ نمایاں ہے۔

مولانا کا تغزل منفرد بھی ہے اور معنویت آمیز بھی! انہوں نے اس صنفِ سخن کو لفظی لحاظ سے بھی ترقی کی جانب گامزن کیا اور معنوی لحاظ سے بھی اسے آراستہ و پیراستہ کیا۔ ان کا کلام صحیح معنوں میں ہمہ رنگ صفات کا آئینہ دار ہے۔ لطافت معنی، باریکی خیال، سخنِ سنجی کی پختگی اور عرفانِ فکر کی بلندی کی بدولت انہوں نے تغزل کو اوج کمال تک پہنچا دیا..... اور اسے ہر صورت میں منہجائے غزل گوئی قرار دے دیا۔ آپ فارسی کے تمام اساتذہ شعراء کے کلام کا مطالعہ کر جائیے۔ ان کے انداز بیان، فکر کی گہرائی اور لب و لہجے کی انفرادیت سے یقیناً متاثر ہوں گے، لیکن جو خوبیاں، جو باریکیاں، جو رعنائیاں اور جو اچھائیاں مولانا جلال الدین رومی کے یہاں آپ کو نظر آئیں گی، وہ بس ان ہی کی دین ہے، ان ہی کا عطیہ ہے اور ان ہی کا حرفِ آخر بھی!

مولانا نے روم کی شاعری ہمہ رنگ، ہمہ موضوع اور ہمہ صفت ہے۔ اسے ہم رسائی مقصود، اتفاق مطلب، لطافتِ معنی، باریکی خیال، فکرِ عرفانی کی صفائی اور پختگی کی شاعری قرار دینے پر مجبور ہیں۔ یہ سراسر شوق و شوق کا مظہر اور ولولہ انگیز جذبات کا آئینہ دار ہے۔ اس میں نہ تصنع کا شائبہ ہے، نہ چربے کا وہم و گمان! یہ سراسر خلایق کا پرتو، ذہنی اختراع کا نمونہ اور تپشِ دل کی آنچ ہے کہ قاری اس وادی بیکراں میں اس طرح گم ہو جاتا ہے کہ اسے خود اپنا وجود اس میں ضم ہوتا دکھائی دیتا ہے۔

مولوی معنوی کی شور انگیز غزل گوئی کا مرکز و محور وصالِ حق بھی ہے اور وجودِ مطلق کا ادراک بھی! ہر غزل کا ہر شعر ہجر و فراق کی داستان اور عشقِ محبوب کا سلگتا ہوا شعلہ ہے۔ تصورِ معشوق کا وجد آفریں ساز اس طرح چھڑتا ہے کہ پوری کائنات اور اس کا ذرہ ذرہ رقصِ کناں نظر آنے لگتا ہے۔ اور جب فراقِ یار کا نعرہ مستانہ بلند ہوتا ہے تو سننے والے کا کلیجہ چھلنی چھلنی ہونے لگتا ہے۔ گویا کلامِ رومی میں جذبات کی صداقت، فکر کی گہرائی اور عشق کی تمازت کچھ اس طرح رچی بسی ہے کہ یہ ”چیزے دیگر است“ کے زمرے میں شامل ہو جاتی ہے۔

پھر، موضوعات کے تنوع نے مولانا نے روم کی شاعری کو بیاباں کی وسعت، سمندر کی بیکرائی اور صحرا کی بے پایانی سے ہم کنار کر دیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بلخ سے کوچ کرنے اور مختلف مقامات سے گزرنے کے تجربے نے جہاں کلامِ رومی میں گہری معنویت پیدا کر دی ہے، وہیں مختلف اکابر سے ملنے اور تبادلہ خیالات کے نتیجے میں ایسی رنگارنگی پیدا کر دی ہے جو ابن بطوطہ کے سفر نامے سے کہیں زیادہ معنی خیز بھی ہے اور اثر انگیز بھی!

ہم ابتدا میں یہ دیکھ آئے ہیں کہ دنیا کے دیگر نامی گرامی شعراء کی حیات کے برعکس رومی کی زندگی طلاطم خیز سمندر کی مانند تھی۔ اس میں ٹھہراؤ نہ تھا، رکاوٹ نہ تھی، تعطل کا شائبہ نہ تھا۔ یہ زندگی ایک ایسے سفر کی مانند تھی جو سدا جاری رہی۔ یہ سارے تجربات، مشاہدات اور تاثرات جو کم عمری سے ہی اثاثہ حیات بنتے چلے گئے، جب ادھیڑ عمری میں مولانا کی سخن گوئی کے دائرے میں سما نے لگے تو گویا ایک بھونچال آ گیا۔ یہ سارے حقائق مسلسل سفر حیات اور متنوع مناظر کے نتیجے میں ہی اشعارِ رومی میں ڈھلے ہیں۔ ان میں کوئی چیز بھی مانگے، تانگے کی نہیں۔ سب کی سب رومی کی اپنی متاع بے بہا ہے جسے ان کی فطری خلایق نے بال پر عطا کر کے دوامی بنا دیا..... اس قول کے مصداق:

ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

مولانا رومی کے کلام میں یہ جو دوامی رنگ پایا جاتا ہے وہ دراصل ان کے عمیق مشاہدے اور دنیاوی تجربے کا ہی رہن منت ہے۔ جیسا کہ قبل لکھا گیا، بچپن سے ادھیڑ عمری تک اور بلخ سے ترکی تک انہوں نے جو کچھ دیکھا، جو کچھ محسوس کیا، اسے نہاں خانہ دل میں محض سینت سینت کر ہی نہیں رکھا بلکہ اپنی شاعری کے فریم ورک میں اسے گاہے بہ گاہے سجاتے بھی چلے گئے ہیں۔ اس طرح ان کا کلام محض ایک مقام، ایک موسم، ایک وقت اور ایک خاص جذبے تک محدود نہیں رہا ہے، بلکہ اس میں آفاقیت پیدا ہو گئی ہے اور یہ ہر دور، ہر زمانے اور ہر مزاج کے قاری کو متاثر کرتا ہے۔ ایسا عموماً کم ہی ہوتا ہے، لیکن مولانا جلال الدین رومی اس لحاظ سے خوش نصیب تھے کہ انہیں ازمن الغیب اس فریضے کی ادائیگی کے لیے شمس الدین تبریزی اور ان کے مرشد بابا کمال کا ”غیر مرئی“ تعاون حاصل رہا۔

اس غیبی طاقت کا ہی نتیجہ ہے کہ رومی کسی ایک موضوع اور کسی ایک عنوان کے اسیر ہو کر نہیں رہ گئے۔ ان کے موضوعات کی کثرت اور عنوانات کا تنوع اس درجہ ہے کہ قاری خواہ کسی بھی ذوق کا حامل ہو، کسی بھی جذبے کا اسیر ہو اور کسی بھی مزاج کا آدمی ہو، کلام رومی اسے متاثر کئے بغیر نہیں رہتا۔

ذرا غور کیجیے! جس شخص کے دادا حسین خطیبی نے شعر نہ کہا ہو، جس کے والد بہاء الدین ولد نے ایک بیت بھی موزوں نہ کیا ہو اور جس نے خود کامل چالیس سال کی عمر تک شعر گوئی کے کوچے میں قدم نہ رکھا ہو، وہ ایک دم شاعر بن جائے، یہ یقیناً ایک راز ہے جس کا ربط سراسر مبدئے فیض سے ہے۔ جب قدرت کو منظور تھا، مولانا جلال الدین کو حریر و پر نیاں کے لباس میں ملبوس کر کے مزین و منقش مسند پر بٹھائے رکھا..... اور جب انہیں شاعر بنانا مقصود ہوا تو ایک ساعت اور ایک آن میں سب کچھ بدل کر رکھ دیا اور مولانا جلال الدین شاعر رومی کے روپ میں اس طرح دنیا کے سامنے آئے کہ ان کے بعد کا ہر شاعر ان ہی کا خوشہ چیں بن گیا۔ گویا رومی نے بزم سخنوراں میں قدم رکھتے ہی اُردو کے عظیم شاعر میر انیس لکھنوی کے انداز میں یہ ضرور اعلان کیا ہوگا۔

لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار
خبر کرد مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

اس حقیقت میں کلام نہیں کہ مولانا جلال الدین رومی نے اپنے ہمہ رنگ کلام کی بدولت مضامین نو کے انبار لگا دیئے۔ ”دیوان شمس تبریز“ ہو یا ”مثنوی معنوی“ وہ ہر جگہ ایک ایسے شاعر کی مانند ابھرتے ہیں جو کسی محدود جھیل میں پیرا کی نہیں کرتا بلکہ قلم بے پایاں ہی اس کی جولانیوں کا مرکز و محور ہے۔ یہ بحر ذخار جو شاعری کے روپ میں فارسی زبان و ادب کے دائرے میں سمودیا گیا، کیا معنی، کیا مفہوم، کیا طرز ادا، کیا جذبہ عشق، کیا رنگ وصال، کیا داغِ فرقت..... ہر متنوع موضوع پر محیط ہے۔ زندگی کا کون سا رخ ہے جو شاعر رومی کی نگاہوں سے اوجھل رہا ہو۔ ایسی کون سی حقیقت ہے جو ”دیوان“ اور ”مثنوی“ کے خالق کے احاطہ فکر میں انگڑائی نہ لے رہی ہو۔

اگر ہم رومی کی غزلیات کے مجموعے اور چھ دفتر پر مشتمل مثنوی کا بغور جائزہ لیں تو برملا یہ کہنا پڑتا ہے کہ ایک دنیائے معانی ان دونوں میں متحرک نظر آتی ہے۔ چونکہ مولانا نے روم تصوف کی وادی سے ہو کر شعر و سخن کے گلزار میں وارد ہوئے تھے، لہذا یہ اہم موضوع ان کی فکر و فہم سے مسلسل دامن گیر رہا ہے اور وہ ایسے ایسے نکات بیان کرتے چلے گئے ہیں جو انہیں کچھ تو خاندانی میراث کے طور پر حاصل ہوئے اور کچھ شمس تبریزی کی صحبت میں میسر ہوئے۔ اس بات کے اظہار میں شمس برابر مبالغہ نہیں ہوگا کہ مولانا نے جو کچھ پڑھا تھا، جو کچھ استادوں سے سیکھا تھا اور جو کچھ دوران تدریس ان پر القا ہوتا چلا گیا تھا، وہ سارے موضوعات نہایت فنکارانہ طور پر ان کے کلام کی زینت بن گئے ہیں..... اور ان میں اضافہ روحانی تعلیم تبریز کی بدولت بہ طریق احسن ہو گیا۔

اگر ہم تجزیہ کریں تو مولانا رومی کی شاعری میں تصوف کے مندرجہ ذیل موضوعات حسن

ابلاغیات کے ساتھ در آئے ہیں:

- الہیات
- وحدت الوجود
- وحدت الشہود
- جبر و قدر
- سلوک و معرفت
- شریعت و طریقت

• فلسفہ حیات

• جدوجہد

• فنا و بقا

• عبادت و ریاضت

یہ وہ موضوعات ہیں جن پر فارسی شعراء اگرچہ اظہار خیال کرتے رہے ہیں، مگر مولانا نے روم کا اپنا ایک خاص انداز ہے اور اسی منفرد پیرائے میں وہ مذکورہ بالا موضوعات کو شعر و سخن کا لبادہ اوڑھاتے رہے ہیں۔ اس طرح وہ کوچہ تصوف میں منفرد مقام کے حامل بن گئے ہیں۔ اس پر خود ان کی اپنی اجارہ داری ہے کہ یہ کسی کی دین نہیں!

مذکورہ موضوعات کے ساتھ ہی حسن و عشق کے مضامین نے جس طرح جلال الدین رومی کے کلام کو ہمہ رنگی عطا کی ہے اور جذبات کے شعلے کو جس انداز میں قرطاسِ سخن پر رکھ کر قارئین کے دلوں کو گرمایا ہے..... اور گرم رہے ہیں..... کیا اس کی مثال دنیا کی کسی بھی زبان کی شاعری میں مل سکتی ہے۔ کیا اس بساطِ ارضی پر کوئی ایسا شاعر گزرا ہے جس نے زندگی کے پاتال میں اتر کر پیچ و خمِ حیات کا تجزیہ کیا ہو۔ جس کے کلام بلاغتِ نظام نے ہزاروں ہزار افراد کے دلوں میں ہلچل مچادی ہو۔ جس کی مثنوی کی شرح وسیع و بسیط انداز میں اس طرح لکھی گئی ہو کہ وہ کئی کئی جلدوں پر مشتمل ہو۔ اور جس کے ترجمے دنیا کی متعدد زبانوں میں ایک ”عبادت“ سمجھ کر کئے گئے ہوں۔ اور کیا کوئی ایسا عالمی شہرت کا حامل شاعر بھی گزرا ہے جس کے اشعار پڑھنے کا ایک خاص انداز وضع کیا گیا ہو¹۔ جو اب یقیناً نفی میں ہوگا..... اوروں کے لیے یہی ”نفی“ مولانا جلال الدین رومی کے لیے ”اثباتِ عظمت“ ہے اور اس

1 مولانا قاری شاہ سلیمان پھلواری سلسلہ چشتیہ کے رکن رکیں اور حاجی شاہ امداد اللہ مہاجر کی کے مسلک سے وابستہ تھے۔ ہندوستان کا گوشہ گوشہ ان کے پُر کیف و پُر اثر خطبوں اور وعظوں سے معمور تھا۔ ندوۃ العلماء اور محمدان ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس مولانا کے وعظ کے بغیر بے مزہ اور پھیکے رہتے تھے۔ نیز، اُردو زبان میں سیرۃ النبیؐ کو زبانی بیان کرنے کی بنیاد سب سے پہلے شاہ صاحب ہی نے ڈالی۔ شاہ صاحب کی ایک اہم صفت مثنوی مولانا روم کی مدہوش کر دینے والی قرأت تھی۔ ان کے زمانے میں مثنوی معنوی کا ان سے بہتر پڑھنے والا کوئی موجود نہیں تھا۔ آپ کے انوکھے طرزِ خطابت اور مثنوی رومی پڑھنے کے مسور کن انداز نے شاہ صاحب کو عوام میں طوطی ہند کے خطاب سے مشہور کر دیا تھا۔

شاہ سلیمان کے چھوٹے صاحبزادے مولانا شاہ جعفر پھلواری نے بھی اپنے والد کے طرز پر مثنوی رومی پڑھنے میں خاصی مقبولیت حاصل کی تھی۔ اہل لاہور خصوصاً اور اہل پاکستان عموماً آپ کے انداز دل سوزی و دل روزی سے متاثر تھے۔

عظمتِ شعری کا ثبوت درج ذیل اشعار کے مطالعہ سے ہمیں مل جائے گا۔

معتوقہ بہ سامانِ شد، تا باد چنین بادا

کفرش ہمہ ایمان شد، تا باد چنین بادا

(معتوقہ اب مائل ہو گئی ہے اور کفر اب ایمان کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ کاش یہ صورت حال اسی طرح قائم رہے۔)

بکشاد نشانِ خود بر بستِ میانِ خود

پر کرد کمانِ خود تا راہ زند مارا

(میرے رہزن نے اپنا علم لہرا کر اور اپنی کمان جوڑ کر مجھے اپنے نشانے پر لے لیا ہے۔)

ای یار ما دلدار ما ای عالم اسرار ما

ای یوسف دیدار ما ای رونق بازار ما

(اے میرے یار تو میرا دلدار ہے، تو عالم اسرار ہے تو یوسف دیدار ہے اور تو رونق بازار ہے۔)

ما خستگانیم و توی صد مرہم بیمار ما

ما بس خرابیم و توی ہم از کرم معمار ما

(ہم تھک کر چور ہو چکے ہیں۔ تو ہی ہماری بیماری کا مرہم ہے۔ ہم ٹوٹ پھوٹ چکے ہیں اور تو ہمارا معمار ہے۔)

ای شاد کہ ماہستم اندر غم تو جانا

ہم محرمِ عشق تو ہم محرمِ تو جانا

(مجھے اس بات پر خوشی ہے کہ میں تیرے غم میں گرفتار ہوں۔ میں ایک طرف تیرے عشق کا محرم بھی ہوں اور خود تیرا بھی محرم ہوں۔)

ای بگرفتہ از وفا، گوشہ کران، چرا چرا

بر من خستہ کردہ ای، روی گران، چرا چرا

(اے با وفا گوشہ نشین مجھ سے کیوں نہیں ہے اور میرے خستہ دل کے لیے تو روئے گراں

کیوں بنا ہوا ہے۔)

یہ عجیب ستم طریفی ہے کہ ثناخوانِ رومی نے ”دیوان“ کو یکلخت فراموش کر دیا اور سب کے سب ”مثنوی“ کی جانب متوجہ ہو گئے..... یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ”دیوان شمس تبریز“ کو رومی و تبریز کی ملکیت کے جھگڑے ہی میں آلودہ کر دیا گیا اور اس کے ہزاروں صفحات پر پھیلے ہوئے جگر کو پاش پاش کرنے والے کلام کو کاہ برابر اہمیت نہ دی گئی ورنہ کوئی امر مانع نہ تھا کہ اس کے تراجم بھی کیے جاتے، تشریح بھی لکھی جاتی اور تفسیر بھی بیان کی جاتی! کیا صنفِ غزل اس اعزاز کی حقدار نہیں!

زیر نظر باب چونکہ رومی کی ہمہ رنگ شاعری کے تجزیے کے لیے مخصوص ہے، لہذا مثنویِ روم کا بھی جائزہ لینا ضروری تھا۔ مگر میں اس سے پہلو تہی اس لئے کر رہا ہوں کہ اگلا باب اسی موضوع پر مشتمل ہے اور تکرار بیان مناسب نہیں لگتا۔ علامہ جمیل مظہری کے اس مصرع پر باب ہذا کو ختم کر رہا ہوں ع

حکایتیں ہیں اور بھی ورق الٹ کتاب کا

مثنوی معنوی..... ایک جائزہ

مجھے یہ کہنے دیجیے کہ ”دیوانِ رومی“ کی تخلیق جہاں شمس الدین تبریزی کی ذاتِ اقدس کی رہین منت ہے، وہاں ”مثنوی“ مولانا نے روم“ فی الحقیقت جلال الدین کے مرید و عقیدت مند حسام الدین چلی کی مہمیز زنی کا ہی ثمرہ ہے۔ انہیں یہ حقیقت معلوم تھی کہ جب مولانا رومی کے والد شیخ بہاء الدین ولد بلخ سے ہجرت کر کے دیارِ مغرب کی جانب روانہ ہوئے تو کچھ عرصہ نیشاپور میں بھی قیام فرمایا تھا۔ وہیں وقت کی جلیل القدر ہستی اور معروف مثنوی نگار شیخ فرید الدین عطار سے ملاقات ہوئی تھی۔ موصوف نے نہ صرف کسین رومی کو دعاء دی تھی بلکہ اپنی کتاب ”اسرار نامہ“ بھی نذر کی تھی۔

حسام الدین چلی کو یہ بھی معلوم تھا کہ مولانا رومی خواجہ عطار کے بے حد گرویدہ تھے اور ان کا تذکرہ بھی نہایت عقیدت بھرے لہجے میں کرتے تھے۔ حتیٰ کہ ایک شعر بھی اس نوعیت کا کہا تھا۔

ہفت شہر عشق را عطار گشت
ما ہنوز اندر خم یک کوچہ ایم

چنانچہ لائق مرید و معتقد حسام الدین چلی نے مولانا رومی سے درخواست کی کہ شیخ فرید الدین عطار کی کتاب ”منطق الطیر“ کے طرز و انداز پر ایک مثنوی لکھی جائے۔ بعض تذکرہ نگاروں نے سنائی کا

نام بھی لیا ہے۔ مولانا جلال الدین رومی نے چلی کی یہ استاد عاں کر بر جتہ جو جواب دیا، اس سے علوم ظاہری کے مرد میداں یقیناً حیران و ششدر ہو جائیں گے:

”عزیز گرامی! خود مجھے بھی رات یہی خیال آیا اور اسی وقت یہ چند شعر موزوں ہوئے۔“

مولانا نے روم یہ کہہ کر مسکرائے اور اپنی دستار کے اندر سے کاغذ نکالا جس پر مثنوی کے ابتدائی اٹھارہ اشعار لکھے ہوئے موجود تھے۔ حسام الدین چلی نے بہ اشتیاق ان اشعار پر نظر ڈالی اور معنی و مفہوم کی تہہ تک پہنچ گئے۔ پھر مزید لکھنے کی گزارش کی اور اس کے لیے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ پھر یہ صورت رہی کہ کامل بارہ سال تک مثنوی کے چھ دفتر اپنے مرید اور شاگرد چلی کو املا کراتے رہے¹۔ اشعار کی مجموعی تعداد 25700 ہے۔

اس حقیقت میں کلام نہیں کہ مولانا نے روم تلمیذ الرحمن تھے۔ ان پر شعر ہر آن وارد ہوتے۔ بعض اوقات رات کو یہ سلسلہ شروع ہوتا اور صبح تک جاری و ساری رہتا تھا۔ بعد میں کاتب مثنوی حسام الدین چلی لکھے ہوئے اشعار پڑھ کر مولانا کو سناتے۔ اس دوران کوئی سقم نظر آتا یا وزن و بحر کی خامی محسوس ہوتی تو مولوی معنوی اس کی تصحیح فرمادیتے تھے۔ اس طرح رومی کی فکری کاوش اور چلی کی املا نویسی کی بدولت جو شاہکار مثنوی کی صورت میں منصفہ شہود پر جلوہ گر ہوا، اس کی بابت خود صاحب تخلیق یہ جملہ رقم کر گئے تھے:

”دوستوں کے لیے یہ نور ہے اور اخلاف کے لیے خزانہ!“

بلاریب، مثنوی مولانا نے روم ہر زمانے میں نور کا ہالابنی رہی ہے اور علم و حکمت کا خزانہ ثابت ہوئی ہے۔ ان دو عناصر کی وضاحت سے قبل ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ آخر تاریخ مثنوی میں ”مثنوی معنوی“ کو سب مثنویوں میں منفرد حیثیت کیوں کر حاصل ہوئی اور اس کے جلائے ہوئے چراغ کی روشنی میں دیگر چراغوں کی نو مدھم کیوں ہو گئی۔ بایں ہمہ، یہ بھی دیکھنا ہے کہ اس صنف شاعری میں ایسی کون سی صفت تھی جس نے مولانا جلال الدین کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لی، اور اس طرح کر لی کہ بس وہ مثنوی ہی کے ہو کر رہ گئے۔

1 درمیان میں حسام الدین چلی کی اہلیہ کی وفات کی وجہ سے یہ سلسلہ رک گیا تھا۔ وہ بیوی کی موت پر غم زدہ تھے اور مولانا رومی بھی چپ رہے۔

غزل گوئی اور قصیدہ نگاری کی طرح مثنوی نویسی بھی فارسی ادب کا طرہ امتیاز رہی ہے۔ اس کی خارجی ہیئت ایسی ہے کہ وسیع و بسیط موضوع کو نہایت سہولت اور تسلسل کے ساتھ حد درجہ رواں اور مترنم بحر میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ کسی بھی مثنوی میں ایک بحر منتخب کر کے مطلوبہ اشعار رقم کر دیئے جاتے ہیں۔ اشعار کی تعداد مقرر نہیں اور صرف ایک شعر کو ہم قافیہ و ہم ردیف ہونا ہوتا ہے۔

چونکہ یہ صنف سخن قافیہ، ردیف اور دیگر پابندیوں میں جکڑی ہوئی نہیں، لہذا مفصل اور وسیع نوعیت کے مضامین کے لیے یہ حد درجہ موزوں اور مناسب قرار دی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شعرائے زبان فارسی نے عشقیہ داستان، عرفانی موضوع اور اخلاقی مضمون کی وسعت و جامعیت کا لحاظ کرتے ہوئے اسی صنف کا انتخاب کیا ہے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ کامیاب و کامران رہے ہیں۔ بے موقع نہ ہوگا کہ اگر ہم یہاں مثنوی کی اہمیت و وقعت کے حوالے سے علامہ شبلی نعمانی کی رائے پیش کر دیں:

”انواع شاعری میں یہ صنف تمام انواع شاعری کی نسبت زیادہ مفید، زیادہ وسیع اور زیادہ ہمہ گیر ہے۔ شاعری کی جس قدر انواع ہیں، سب اس میں نہایت خوبی سے ادا ہو سکتے ہیں۔ جذبات انسانی، مناظر قدرت، واقعہ نگاری، تخیل..... ان تمام چیزوں کے لیے مثنوی سے زیادہ کوئی میدان ہاتھ میں نہیں آ سکتا۔ مثنوی میں اکثر کوئی تاریخی واقعہ یا کوئی قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ اس بنا پر زندگی اور معاشرے کے جس قدر پہلو ہیں، سب اس میں آ جاتے ہیں۔ عشق و محبت، رنج و مسرت، غیظ و غضب، کینہ و انتقام، غرض جس قدر انسانی جذبات ہیں، سب کے سماں دکھانے کا موقع مل سکتا ہے۔ اخلاق، فلسفہ، تصوف کے مسائل نہایت تفصیل کے ساتھ ادا کیے جاسکتے ہیں۔“

مثنوی کی مذکورہ ہیئتی خصوصیات کی بنا پر فارسی زبان و ادب کے ممتاز شعراء نے اپنے وسیع و عریض اور بسیط و بے شمار خیالات و افکار کے اظہار کے لیے اسے اختیار کیا اور ایک دنیا کو مجو حیرت کر دیا۔ ان میں ابوشکور بلخی ہیں، مسعودی رازی ہیں، اور زود کی جیسی ممتاز شخصیت ہے جس نے چوتھی صدی ہجری کے اوائل میں ”کلیہ و دمنہ“ کو مثنوی کی ہیئت میں منظوم کیا۔ بایں ہمہ، قدیم ترین فارسی مثنوی شاہنامہ دقیقی طوسی ہے۔ یہ وہ مثنوی ہے جس کے ایک ہزار اشعار کو فردوسی جیسے عظیم شاعر نے اپنے شاہنامہ میں نقل کر کے اسے معدوم ہو جانے سے بچالیا۔ پھر، عہد غزنوی میں معرکتہ الآرا نوعیت کی

مثنویاں لکھی گئیں۔

مذکورہ دور میں فارسی کے ممتاز سخن گو عنصری نے بھی کئی مثنویاں تحریر کیں۔ مثلاً اوا مق و عذرا، سرخ بت وغیرہ! یہی وہ غزنوی دور ہے جس میں طرہ امتیاز کی حامل مثنوی یعنی ”شاہنامہ فردوسی“ لکھی گئی۔ اگرچہ بعد کے متعدد فارسی گو شعراء اس مثنوی کے تتبع میں اپنی اپنی مثنویاں رقم کرتے رہے، مگر جو شہرت و مقبولیت ”شاہنامہ فردوسی“ کو حاصل تھی، اس کی گرد کو اس دور کی کوئی بھی مثنوی پہنچ نہ سکی۔ آج بھی اس کا جواب نہیں!

ازاں بعد، اس صنف سخن کو وسعت و منزلت عطا کرنے والے فارسی شعراء میں متعدد نام سامنے آتے ہیں، مثلاً اسد طوسی، سنائی، نظامی گنجوی اور شیخ فرید الدین عطار! ان سب کی فکری کاوشیں اور ادبی محاسن فارسی مثنوی گوئی کو عروج و استحکام عطا کرنے میں مدد و معاون ثابت ہوئے ہیں۔ ان تمام مثنوی گوئیوں نے مثنوی کے مروجہ خاکے میں جو رنگ بھرا ہے وہ تاریخی نوعیت کا حامل ہے۔ ان مثنویوں میں موضوع کی وسعت ہے، خیال کی گہرائی ہے، فکر و دانش کی پہنائی ہے، جذبات کی بوقلمونی ہے، عشق کی آنچ ہے، حُسن کی دلفریبی ہے، رزم کی جھنکار ہے، عاشق و معشوق کی داستانِ فراق و وصال ہے اور تصوف کے مضامین ہیں۔ ان تمام عناصر نے فارسی زبان و ادب کے متذکرہ بالا شاعروں کی مثنویوں کو بام عروج تک پہنچا دیا تھا۔

بے موقع نہ ہوگا اگر ہم یہاں ایک لمحہ رُک کر ”ادب نامہ فارسی“ کے مصنف مقبول بیگ بدخستانی کی مندرجہ ذیل رائے کا جائزہ لے لیں:

”ایران کے متقدمین میں اقلیم سخن کے بڑے بڑے تاجدار گزرے ہیں۔ لیکن کسی کی قوت سخن سرائی میں نظامی کی طرح ہمہ گیری نہ تھی۔ فردوسی کا نام رزمیہ مثنوی کی بدولت زندہ ہے۔ خیام نے رباعی کے ذریعے فلسفہ و حکمت کی ترجمانی کی۔ انوری و خاقانی فلسفے کے استاد تھے۔ سعدی غزل اور اخلاقی شاعری کے بادشاہ ہیں۔ حافظ غزل سرائی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ عطار نے صوفیانہ مطالب مؤثر انداز میں بیان کئے ہیں۔“

یہ حقائق ادبی و تاریخی لحاظ سے اپنی جگہ درست ہیں اور قابل اعتماد بھی! لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مولانا جلال الدین رومی اپنا ایک مستقل رنگ اور اپنی ایک مستقل آواز رکھتے ہیں۔ انہوں نے

صوفیانہ شاعری میں اپنا بلند وبالا اور دلکش قصر الگ ہی تعمیر کیا ہے اور اس پر اپنا دائمی پرچم لہرا دیا ہے۔ اس کا نظارہ محض قونیہ کی حدود تک محدود نہیں، بلکہ تمام اقصائے عالم میں اس کی جلوہ ریزیاں دل و نگاہ کو مسحور کیے دے رہی ہیں۔

”مثنوی معنوی“ مولانا کا ایک ایسا شاہکار ہے جس نے شہرت و مقبولیت میں دیگر تمام تخلیقات فارسی کے مقابلے میں ابدیت حاصل کر لی ہے۔ اس شاہکار کی عظمت و رفعت کے قائل اہل زبانِ فارس ہی نہیں، مغربی علوم کے ماہرین بھی پیش پیش رہے ہیں اور ایسے کہ اپنی زندگی کا بیشتر حصہ شاہکارِ رومی کو سمجھنے، اس کا ترجمہ کرنے اور اس کی تشریح بیان کرنے میں گزار دی۔ ان میں نمایاں نام حسب ذیل ہیں:

- آر۔ اے۔ نکلسن
- سر جیمیس ریڈ ہاؤس
- ای۔ ایچ۔ وھنفلڈ
- ای۔ جی۔ براؤن
- ڈاکٹر این میری شیمل
- ولیم سی، چنگ
- ہیڈ لینڈ ڈیوس
- ای۔ ای۔ پامر

مذکورہ بالا مغربی مصنفین کا مطالعہ رومی، تحقیق رومی اور ترجمہ و تشریح رومی کا جذبہ بے پایاں اس امر کا غماز ہے کہ یہ ادبی شخصیات ”مثنوی معنوی“ کے نہ صرف مطالعہ میں غرق رہیں بلکہ مولانا کے روم کے ارفع و اعلیٰ افکار و نظریات سے متاثر بھی ہوتی رہیں۔ یہ حقیقت ثابتہ بلا شک و شبہ اس بات کو ثابت کر رہی ہے کہ دنیائے مثنوی میں مولانا کے روم نہ صرف منفرد مقام کے حامل رہے ہیں بلکہ چھ جلدوں پر مشتمل اس مجموعے نے فکر و دانش کے وہ وہ موتی بکھیرے ہیں اور ایسے ایسے جواہر پارے اچھالے ہیں کہ ان کی تابانی نے ہر گوشہ دل کو اجال کر رکھ دیا ہے۔ یہ بہت بڑا اعزازِ رومی ہے جو بلا ریب ان ہی کا مقدر بنا ہے اور اس عطیہ خداوندی میں کوئی اور نہ ان کا شریک ہے اور نہ ان کے مد مقابل!

اس حقیقت میں ذرا بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ مولانا جلال الدین رومی کی ”مثنوی معنوی“ فارسی ادب تو کیا، ادبیات عالم میں ایک ایسے شاہکار کا مقام و مرتبہ حاصل کر گئی ہے جو عرفانی بھی ہے اور لافانی بھی! اور اس کی تمام تر وجہ ان کا عارفانہ انداز بیان اور صوفیانہ طرز کلام ہے۔ مشرق و مغرب کے تمام ناقدوں کی یہ متفقہ رائے ہے کہ مولانا نے روم دنیا کے سب سے بڑے صوفی شاعر ہیں اور ہم مثنوی کو ان کے افکار عالیہ کا گراں بہا مرقع اور بلند پایہ اشعار کا دلکش و دل پذیر مجموعہ قرار دے سکتے ہیں۔

یوں تو تصوف کے موضوع پر دنیا کے مختلف شعراء نے خامہ فرسائی کی ہے اور ایک فقیر بے ریا کے جذبہ صادق کی ترجمانی کو اپنا شعار بنایا ہے۔ اس قبیل کے سخنوروں کی فکری کاوش قابل تعریف ہے، لیکن یہ اعزاز صرف مولانا جلال الدین رومی کو ہی حاصل ہے کہ ان کی ستائیس ہزار سے زائد اشعار پر مشتمل مثنوی فارسی زبان و ادب میں تصوف کا ایک مکمل ترین، جامع اور مبسوط دیوان ہے جو اسی گلدستے کی مانند ہے جسے، بقول کراخاتون، چہرہ جال الغیب نے نصف شب کو دیوار شق کر کے اندر آ جانے کے بعد مولانا روم کو مرحمت کیا تھا اور جو مولانا نے محترم کی وفات کے سالہا سال بعد بھی اسی طرح تروتازہ، معطر اور پُر بہار تھا۔ اور یہ ”مثنوی معنوی“ بھی اسی آفاقی گلدستے کی مانند صدیاں گزر جانے کے بعد بھی رنگ و نور و بونے گلشن کی ابدی حیثیت اختیار کر گئی ہے اور اس پر یہ فقرہ ہر طرح صادق آتا ہے:

ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

دوامی حیثیت اختیار کرنے والی ”مثنوی معنوی“ متنوع موضوعات اور فکر و دانش کا جہاں ایک مرکز و منبع ہے، وہاں اس کی انفرادیت بھی کلاسیکی ادب میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ آپ کوئی کتاب، کوئی دیوان، کوئی مجموعہ اٹھا کر دیکھیں، اس کا آغاز مروجہ طریقے سے ہوا کرتا ہے۔ کہیں حمد ہوتی ہے، کہیں نعت مندرج ہوتی ہے اور کہیں منقبت رقم کی جاتی ہے۔ یا پھر ”تمہید“ سے آغاز ہوا کرتا ہے۔ مگر مولانا نے روم کے انفرادیت پسند مزاج نے اس مروجہ انداز اور رسمی طریقہ کار سے اجتناب برتا اور وہ براہ راست آغاز کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ عرفانی رنگ و آہنگ قاری کو دم بخود کر دیتا ہے۔

بشنو از نئے چوں حکایت می کند
 وز جداییها شکایت می کند
 کز نیستای تا مرا بریدہ اند
 از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند
 سینہ خواہم شرح شرح از فراق
 تا بگویم شرح درد اشتیاق

(سنو کہ بانسری کیا حکایت بیان کرتی ہے اور جدائی کے لمحات کی کس طرح شکایت کرتی ہے۔
 وہ یہ کہہ رہی ہے کہ جب سے مجھے بانس کے جنگل سے کاٹ دیا گیا ہے، میرے نالہ و فریاد سن
 کر سب ہی مرد و زن آہ و فغاں کرنے لگے ہیں۔ میں ایسا سینہ چاہتی ہوں جو فراق کے درد
 سے پارہ پارہ ہو چکا ہوتا کہ میں اسے سناؤں کہ عشق کا کرب و الم کیا ہوتا ہے اور فراق یار کے
 لمحات کس درجہ سوہان روح ہوا کرتے ہیں۔)

مولانا نے روم کی ضخیم و جلیل مثنوی کا سرنامہ آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ دنیا کے تمام ادبی
 شاہکاروں میں اس انداز کا آغاز ہمیں شاذ و نادر ہی نظر آئے گا جو ایک ایسے موضوع پر مبنی ہے جو
 فی الحقیقت انسان کی اپنی کہانی ہے۔ وہ انسان جس کا پتلا خالق ارض و سما نے خود اپنے دست قدرت سے
 بنایا اور اس ہیولے میں روح پھونکی۔ جس کا مستقر تھا فردوس بریں! جس کے تصرف میں بہشتی نعمتیں
 تھیں! جسے قرب خداوندی حاصل تھا۔ مگر ایک لغزش پا کے نتیجے میں زمین کے پاتال میں پھینک دیا
 گیا۔ جہاں وہ پے پے حوادث کا شکار ہوا، رنج و محن سے دوچار ہوا، فراقِ محبوب ازلی میں اس کا سینہ
 فگار ہو گیا..... یہ سارے عناصر کوئی تخیلاتی کہانی نہیں، زندگی کی حقیقت ہے..... ایک ایسی حقیقت جو
 فرسودہ دلی اور محزوں طبعی سے عبارت ہے۔ یہ ابن آدم کا مقدر ہے اور اس سے پہلو تہی برتنا گویا انسانی
 نفسیات کی نفی کرنا ہے۔

مولانا نے روم سے بڑھ کر کون انسانی نفسیات کا راز داں ہو سکتا ہے، جن کی ساری زندگی
 حادثات کے پیچ و خم سے وابستہ رہی۔ ایک عظیم مدرسے کے مدرس اعلیٰ کی حیثیت سے وہ ہزاروں ہزار
 طلبہ کے مزاج آشنا تھے۔ جنہوں نے حیاتِ دو روزہ کے ہر ہر رخ کو بنظر غائر دیکھا تھا۔ جو سلطنت

خوارزم شاہ کے مفتی اعظم تھے اور عوام الناس کے پیچیدہ مسائل سے ہر آن آشنا ہوا کرتے تھے۔ جنہوں نے وقت کی طنابوں کو اپنی مٹھیوں میں سمیٹ لیا تھا۔ ایسا ہی شخص بانسری کے درد بھرے نغمے کا ذکر کر کے عالمی ادب میں اپنی انفرادیت کا علم بلند کر سکتا ہے۔ اور جلال الدین بلخی ثم رومی نے ایسا کر دکھایا اور بہ انداز دگر!

آپ اسی آغاز سے اندازہ لگالیں کہ چھ جلدوں پر مشتمل اس مثنوی میں کیا کچھ نہ ہوگا..... حیات و کائنات روز ازل سے انسانی فکر کا محور رہی ہے۔ مولانا رومی نے اس اہم موضوع کے بارے میں فلسفیانہ و حکیمانہ نکات بیان کئے ہیں۔ مختلف صوفی بزرگوں اور شاعروں کا تذکرہ ان کے فکر و خیال کے حوالے سے کیا ہے اور اپنی وسیع النظری کا ثبوت فراہم کر دیا ہے۔ قرآن مجید کے دقائق و رموز شگفتہ و شیریں زبان میں درج کئے ہیں۔ روزمرہ زندگی کے واقعات کا تذکرہ اس طرح کیا ہے جسے ہم نے کبھی کاہ برابر اہمیت نہ دی، لیکن مولانا نے مثنوی کا حصہ بنا کر اس کی اہمیت اجاگر کر دی۔

مولانا نے روم کی نگاہ عمیق تھی۔ انہوں نے انسانی زندگی کے خفتہ گوشوں کو دائرہ نور میں لا کر اس بات کا ثبوت فراہم کر دیا کہ وہ دانا بھی تھے اور بینا بھی! ان کا فکر و شعور بیکراں سمندر کی مانند تھا جس کی موجیں ہمیشہ ارتعاش پذیر رہتی ہیں اور تاحد نظر اس بحر بے پایاں کا کنارہ نظر نہیں آتا۔ ایسی جولانی، ایسی بیکرانی، ایسی وسعت اور ایسی پہنائی ہمیں دنیا کے بڑے سے بڑے شاعر کے یہاں مشکل ہی سے نظر آئے گی۔ ہم بلا خوف و تردید یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ مثنوی عطیہ خداوندی تھا جو شمس تبریز کی جدائی میں منصف شہود پر جلوہ گر ہوا اور اپنی جلوہ گری سے ایک عالم کو ہنوز دم بخود کئے ہوئے ہے۔

بعض سخنوروں کی سخن سنجی محض ان کے اپنے جذبات کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ ان کی اپنی دلی کیفیات اشعار کے روپ میں جلوہ گر ہوتی ہیں۔ چونکہ قارئین کے اپنے جذبات و محسوسات کے ڈانڈے زیر بحث شاعر کی قلبی واردات سے ملتے ہیں، لہذا وہ متاثر بھی ہوتے ہیں اور واہ، واہ کا کلمہ تحسین بھی ان کی زبان پر جاری ہو جاتا ہے۔ اس خصوصیت سے ہم شتمہ برابر انکاری نہیں۔ مگر آفاقی رنگ، دائمی نشان اور ابدی تاثر کچھ اور ہی چیز ہے جو ہر کے بس کا روگ نہیں!

مولانا نے روم دنیا کے عظیم شعراء کی صف اول میں سے بھی بلند ایک مخصوص مقام کے حامل سخنور تھے۔ وہ اپنا کلام خود کہتے نہ تھے، ان سے نیبی طاقت کہلاتی تھی۔ چنانچہ ایسے شعری افکار کا دائرہ

مخصوص و محدود نہ تھا، وقتی و لمحاتی نہ تھا، خاص الخاص سامع و قاری کے لیے نہ تھا..... اس مثنوی کے مخاطب پورا عالم اور اس میں بسنے والے انسان تھے، ہر زمانے کے لوگ تھے، ہر دور کے باشندے تھے۔ ان سبھوں کے لیے یہ اشعار پیش کئے گئے تھے اور کچھ اس طرح۔

سارے عالم پہ ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے مرا فرمایا ہوا
(میر)

اپنے مستند افکار و نظریات کے ذریعے پورے عالم پر چھا جانے والے مولانا جلال الدین رومی کی ”مثنوی معنوی“ کا اگر ہم بنظر غائر جائزہ لیں تو ایسا محسوس کریں گے کہ اس کی حیثیت ایک انسائیکلو پیڈیا کی ہے۔ زندگی خود ایک اہم موضوع ہے اور اس سے وابستہ حقائق متعدد بھی ہیں، متنوع بھی! لا محدود بھی ہیں اور لامتناہی بھی!..... مولانا نے ان تمام عوامل کا بنظر غائر جائزہ لے کر انہیں اس طرح سبک و شیریں انداز میں پیش کیا ہے کہ ”دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست“ کے مصداق ہر قاری ان اشعار مثنوی کا اسیر ہو جاتا ہے۔

مولانا رومی بنیادی طور پر ایک معلم تھے۔ قونیہ کے سب سے عظیم مدرسے کے مہتمم تھے۔ ان کی سرپرستی میں ہزاروں طلبہ حصول علم و ادب میں مشغول رہتے تھے۔ جب وہ اپنے مکان یا مدرسے سے باہر جاتے تھے تو طالب علموں کا جم غفیر ان کی سواری کے جلو میں پایادہ رواں دواں رہتا تھا۔ اس دوران بھی درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہتا۔ مولانا اپنے طلبہ کو حکمت کی باتیں بتاتے رہتے۔ گویا نو عمر افراد کی تہذیب و تعلیم سے وہ کبھی غافل نہیں رہے۔

اس حقیقت کو ذہن میں رکھتے ہوئے جب ہم مثنوی کا مطالعہ کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے اس تدریسی دور کو بھولے نہیں ہیں اور اس مجذوبانہ و عارفانہ طرز زندگی میں اس ہدایت و تعلیم کو سخن پروازی سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ اس قلبی ماہیت کی تبدیلی کے دور میں جب وہ مثنوی کے ذریعے سامع و قاری سے مخاطب ہوتے ہیں تو ان کے پیش نظر عالم بھی ہیں، عارف بھی! مبتدی بھی ہیں اور عوام الناس بھی! طلبہ بھی ہیں اور نو عمر افراد بھی! وہ ان سبھوں سے ایک مشفق استاد کی طرح ہمکلام

ہوتے ہیں اور ایسی زبان استعمال کرتے ہیں جو ان سمجھوں کی سمجھ میں آسکے۔

اگرچہ مولانا رومی سے پیشتر تمثیلی انداز و طریقہ کار کا رواج تھا۔ اکثر مثنوی نگاروں نے جانوروں اور پرندوں کی حکایات بیان کی ہیں اور ان سے دلچسپ انداز میں نتائج اخذ کیے ہیں۔ لیکن ہمارے ممدوح نے اپنے فلسفیانہ شعور اور شاعرانہ صلاحیتوں کی بدولت اس انداز تمثیل نگاری کو مرتبہ کمال تک پہنچا دیا۔ اس طرح ان کے اشعار دیر پا اثرات کے حامل بن جاتے ہیں اور اسرار کائنات اور ان سے انسانی روابط کو بہ خوبی اجاگر کرتے ہیں۔ مولانا رومی نے تمثیل نگاری کے ذریعے انسانوں کی تعلیم و تہذیب کا جو انداز اپنایا ہے، اس نے ان کو دنیائے ادب میں ابدیت عطا کر دی ہے۔

مولانا نے روم کی زیر بحث مثنوی کی اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ متعدد ایسے مسائل پر انہوں نے گفتگو کی ہے جن کے متعلق مذہبی، اعتقادی، جذباتی اور عقلی لحاظ سے خاصا اختلاف پایا جاتا ہے۔ لیکن وہ ایک حکیم حاذق اور مصلح اعظم کی حیثیت سے ان پیچیدہ اور اختلافی امور کو مناظرے کی صورت میں، دلائل و براہین کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ زیر بحث مسائل کے مثبت اور منفی پہلوؤں کو منطقی انداز میں پیش کر کے اپنی محققانہ رائے کا برملا اظہار کرتے ہیں اور اپنا حتمی فیصلہ سنا دیتے ہیں۔

یہاں وہ ایک عظیم مفتی کا روپ دھارے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایک ایسا مفتی جس کی نظر تمام مباحث پر ہے۔ جو مسئلے کے پیچ و خم سے واقف ہے۔ جس کی نگاہ طبیعات و مابعدالطبیعات پر پوری طرح جمی ہوئی ہے۔ جو تعصب، بغض، حسد، فرقہ واریت سے پرے، ایک ایسا فتویٰ صادر کرتا ہے جو ہر فرقے، ہر نظریے کے حامل شخص اور مختلف سوچ رکھنے والے بندے کے لیے قابل قبول بن جاتا ہے۔ وہ دراصل دوران کار اور لایعنی باتوں میں پڑے بغیر مسئلے کا حل ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ وہ جو تم پیزار، لڑائی جھگڑے اور فتنہ و فساد کو انسانیت کے لیے ستم قاتل سمجھتے ہیں۔

مولانا نے مثنوی معنوی میں حضرت موسیٰ اور ایک چرواہے کا واقعہ بیان کیا ہے۔ آخر الذکر کسی جنگل میں بیٹھا اللہ تعالیٰ کو ایک گوشت پوست کا پیکر سمجھ کر اس سے اظہار عشق و محبت کر رہا تھا اور کچھ اس طرح:

”اگر تو میرے پاس ہوتا تو میں تیری کنگھی چوٹی کرتا، تجھے ہتھی لگاتا، غازہ ملتا، لباس تبدیل کرتا، وغیرہ وغیرہ!“

حضرت موسیٰ نے یہ کلمات سنے تو بہت ناراض ہوئے اور کہا کہ ”تو خدا کی شان میں کیا کفر بک رہا ہے۔“ وہ چرواہا گھبرا اٹھا، دہل گیا اور مارے ندامت کے سر جھکا لیا۔ اسے اس امر کا شدید احساس ہونے لگا کہ اس نے اپنے محبوب (بارئ تعالیٰ) کی شان میں گستاخی کی ہے۔ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا..... اور اُدھر اللہ تعالیٰ کو چرواہے کا یہ انداز مخاطب بے حد اچھا لگ رہا تھا۔

جب چرواہے کو چپ لگ گئی، وہ دہشت زدہ ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ پر جس طرح اپنی برہمی کا اظہار کیا اسے مولانا رومی نے نہایت مؤثر انداز میں پیش کر دیا ہے۔

تُو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی

مولانا نے روم اللہ تعالیٰ کے اس تنبیہی پیغام پر ہمیشہ کار بند رہے۔ وہ مسلمانوں کے اختلافی مسائل کو ختم کر کے ان سبھوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کے آرزو مند تھے۔ اور ”مثنوی معنوی“ اس نظریہ رومی کی بھرپور تفصیل ہے۔ موصوف کی یہ کوشش رہی ہے کہ اپنی مثنوی کے ذریعے تمام بندگانِ خدا کو ایک مرکز پر لائیں جہاں خلق و محبت کی فضا ہو، اخوت اور ملاپ کا سماں ہو، رنگِ وحدت و یکسانیت ہو اور تمام بنی نوع انسان خاندانِ آدم علیہ السلام کی اکائی بن کر رہیں۔

میرا یقین کامل ہے کہ دنیا کے کسی بھی شاعر نے اس انداز سے ابن آدم کو متحد کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ دیگر شعراء اپنے ملک، اپنے ماحول، اپنی تہذیب، اپنے نظریے اور خود اپنی ”انا“ کے زیر اثر بنی نوع آدم کو درس دیتے رہے ہیں۔ ان سبھوں کی اہمیت سے انکار نہیں۔ لیکن یہاں یہ کہے بغیر رہا نہیں جاتا کہ مولانا جلال الدین رومی نے اپنے آپ کو ذاتِ پات، ماحول، تہذیب و ثقافت کے خول میں بند نہیں کیا تھا۔ ان کی نگاہ میں وسعت تھی۔ ان کی سوچ آفاقی تھی۔ ان کی فکر کا کینوس لامحدود تھا۔ وہ کسی خطے، کسی مخصوص مقام، کسی خاص دیار، کسی ملک و ملت کے شاعر نہ تھے، بلکہ پوری کائنات کے سخنور تھے۔ اس کی تمام تر وجہ یہ ہے کہ انہیں مبدئے فیض سے سخن سنجی کا ملکہ راتوں رات ودیعت ہوا تھا، اور ایسے وقت میں جب وہ نصف عمر گزار چکے تھے۔ گویا مولانا روم ”اوپر والے“ کا ایک عطیہ تھے، ساری دنیا اور اس میں رہنے والوں کے لئے! ایسا شاعر

آفاقی نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا۔

آپ غور کریں کہ مبدئے فیض نے نہ صرف اپنے ”تلمیذ الرحمن“ سے مثنوی معنوی لکھوائی بلکہ اس کے بین الاقوامی سطح پر ترجمے کا بندوبست بھی کر دیا۔ دنیا کی تمام تر زبانوں میں ترجمہ ہو کر اس مثنوی نے اصلاح انسانیت کے لیے جو شمع روشن کی ہے، اس کی روشنی نے رب العزت کی ایک وسیع خلقت کو بھٹکنے سے بچایا ہے اور زندگی کی صحیح سمت میں رہنمائی کی ہے۔ کہیں صفات باری تعالیٰ کو اس طرح پُر اثر اور بامعنی انداز میں بیان کیا ہے کہ ذات الہی کے ضمن میں پائے جانے والے تمام نزاعی مسائل کا ازالہ ہو گیا اور ہر کہہ و مہمہ ”مثنوی“ کی مدد سے یہ باور کرنے پر دل و جان سے آمادہ ہو گیا کہ

ایں جلالت در دلالت صادق است

جملہ ادراکات پس او سابق است

(خدا کی عظمت و شان اس کے وجود کی سچی دلیل ہے۔ تمام ادراک و شعور پس پشت رہ

جاتے ہیں۔)

مولانا نے روم نے اپنے پُر اثر کلام میں حکمت و دانش اور علم کلام کے نہایت وقیع اور پیچیدہ مسائل نہایت دلآویز اور شاعرانہ لب و لہجے میں اس طرح بیان کیے ہیں کہ قاری کے ذہن میں ہر گتھی سلجھتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور اس کے سارے شکوک و شبہات کا عدم ہونے لگتے ہیں۔ وہ فکر و شعور کی جن بھول بھلیوں کا شکار ہو کر غلط فہمیوں کے لقمہ و دق ریگ زار میں ٹانک ٹوئیاں مارتا رہا، ان سے مطالعہ مثنوی کے بعد اسے نجات مل جاتی ہے۔ گویا یہ مثنوی معنوی ایک کرشمہ ہے، ایک معجزہ ہے، اور ایسی چیز انسان کی اپنی کہی ہوئی نہیں ہوتی، بلکہ کہلوائی ہوئی ہوتی ہے..... یہی فرق ہے مولانا جلال الدین رومی کے کلام اور دنیا کے عظیم شعراء کے کلام میں! ایک اپنی انسانی فکر کی مدد سے شعر کہتا ہے اور ایک مبدئے فیض سے القا شدہ اشعار حسام الدین چلی کو املا کرتا ہے۔ گویا مولانا نے روم اپنے ذہن کے کینوس پر عالم بالا سے منعکس ہونے والے اشعار کو صاف اور صریح طور پر دیکھ رہے تھے، اور پھر چلی کو بتاتے جاتے تھے۔ اس طرح ”مثنوی معنوی“ منصہ شہود پر جلوہ گر ہوئی اور آج ساڑھے سات سو سال کا طویل عرصہ گزر جانے کے بعد بھی بہ حسن کمال جلوہ گر ہے۔

سطور بالا میں راقم نے جو یہ بات لکھی ہے کہ مولانا روم ”عالم بالا سے منعکس ہونے والے اشعار کو صاف اور صریح دیکھ رہے تھے“ وہ دراصل ایک عالم دین، صوفی اور صاحبِ دل شاعر¹ کے اس شعر کی ترجمان ہے جس کی سماعت پر محفلِ سماع میں اہل تصوف اور اصحابِ طریقت کئی گھنٹے تک عالم وجد میں رقص کناں رہے۔

عالم تمام آئینہ حسن دوست ہے
لیکن نصیب وسعتِ ذوقِ نظر نہیں

مولانا جلال الدین رومی کو یہ ”وسعتِ ذوقِ نظر“ صرف اور صرف ایک صوفی باصفا، ایک درویشِ کامل اور ایک مجذوبِ وقت..... حضرت شمس تبریز کی بدولت حاصل ہوئی اور ایسی کہ سطحِ سمندر کی لہروں کی طرح یہ پھیلتی چلی جا رہی ہے تالا حدِ نگاہ، تا کنارِ بیکراں!

میں نے ہر تین چار سطروں کے بعد اشعار رومی درج کرنے کے مروجہ اصول سے انحراف کیا ہے، اس لیے کہ اشعار کے اندراج سے تحریر کی روانی میں اٹکاؤ پیدا ہونے لگتا ہے اور لکھنے والا جس جذبہِ خلوص کے ساتھ رومی کے افکار و نظریات کو اجاگر کرنا چاہتا ہے، اس میں شعری اندراج سدراہ ہو جاتا ہے۔ اس کتاب کا مقصد مولانا روم کے کلام کی تشریح و تفسیر نہیں، ایک جائزہ ہے اور قاری کے ذوق کی تسکین کے لیے سولہویں باب میں کلام رومی کا انتخاب درج کیا جا رہا ہے۔ البتہ چلتے چلتے دل میں یہ خواہش بے طرح انگڑائی لے رہی ہے کہ مثنوی کا وہ حصہ پیش کر دوں جہاں ”زبان“ بے وجہ باہمی مخالفت اور نزاع کا سبب بن جاتی ہے۔ اس کے بولنے والے تعصب اور تنگ نظری کے زیر اثر آپس میں جو تم پیزار ہو جاتے ہیں اور کشت و خون کا اندوہ گیس نظارہ آنکھوں کے سامنے نمایاں ہو جاتا ہے۔ (پاکستان میں اس کی متعدد مثالیں سامنے آئی ہیں۔)

مثنوی کا مذکورہ حصہ درج کرنے سے قبل ایک حدیث مبارکہ کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

وَهُوَ هَذَا :

1 مولانا شاہ منظور الرحمن اختر کا کوی مرحوم اردو کی مشہور کتاب ”بزمِ صوفیہ“ کے مصنف سید صباح الدین عبدالرحمن کے عزیز اور ہم مکتب تھے۔ مولانا نے کامل پچاس سال تک عیدین کی امامت کے فرائض انجام دیئے۔ قرآن پاک کا منظوم ترجمہ کیا۔ زندگی کی آخری امامت عید سے تین دن پہلے 27 رمضان المبارک کو رحلت فرما گئے۔

اطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ كَانَتْ فِي السَّيْنِ ۝

(علم حاصل کرو خواہ اس کے لیے تمہیں چین کا سفر کرنا پڑے۔)

مذکورہ حدیث مبارکہ کے مطالعہ کے بعد پہلی بات تو یہ سامنے آتی ہے کہ کہاں حجاز مقدس اور کہاں چین؟ فاصلہ طویل، راستہ دشوار گزار، وسائل محدود، مواصلاتی نظام عنقا! لیکن حصولِ تعلیم کے لیے اللہ کے آخری نبیؐ نے یہ سب مصائب برداشت کرنے کی ترغیب دی ہے۔ اور انہی مصائب میں ایک ”زبان“ کا مسئلہ بھی ہے۔ ظاہر ہے اہل حجاز عرب تھے، عربی زبان بولتے تھے، انہیں اپنی زبان پر فخر و ناز تھا۔ وہ اپنے سوا، دنیا کے تمام انسانوں کو ”عجمی“ یعنی گونگا کہتے تھے۔

اور ان ہی لوگوں کو اہل عجم کے پاس جا کر تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب دی جا رہی ہے۔ ظاہر ہے، اہل چین سے (جو زمانہ قدیم سے اپنی فکر و دانش میں ممتاز و معروف تھے) علم (یعنی حکمت و دانش مندی) حاصل کرنے کے لیے ان کی زبان سیکھنی لازمی تھی۔ اس طرح آنحضرتؐ نے حصولِ علم کے ساتھ ساتھ حصولِ زبان کی تاکید بھی فرمائی ہے۔ گویا آپؐ کی نظر میں ہر زبان بولنے والا اپنی جگہ مقتدر تھا¹ اور اس طرح اس کی عزت و توقیر لازمی تھی۔

اب مثنوی ملاحظہ فرمائیں:

چار کس را داد مردے یک درم
 ہر یکے از شہرے افتادہ بہم
 فارسی و ترک و رومی و عرب
 جملہ باہم در نزاع و در غضب
 فارسی گفتا ازین چون وارہیم
 ہم بیا کایں را بہ انگورے دہیم
 آن عرب گفتا معاذ اللہ لا
 من عنب خواہم نہ انگور اے دعا

1 قارئین! آنحضرتؐ کا یہ فرمان آج سے سوچوہ سو سال پہلے کا ہے..... اور اب، اکیسویں صدی میں ہم زبان کے مسئلے پر باہمی نفرت، کدورت، تعصب، خصامت اور مخالفت کے شکار ہیں۔ آپس میں لڑنے مرنے کے لیے تیار ہیں۔ کاش مولانا روم کی مثنوی کا مذکورہ حصہ دنیا کی جملہ جامعات کے نصاب میں شامل کیا جاتا۔

آن یکے کز ترک بد گفت اے کزم
 من نمی خواہم عنب خواہم ازم¹
 آن کہ رومی بود گفت این قیل را
 ترک کن خواہم من استافیل² را
 در تنازع مشت برہم می زدند
 کہ ز سر نام ہا غافل بند
 صاحب سرے عزیزے صد زبان
 گربدے آنجا بدادے صلح شان
 پس بگفتے او کہ من زین یک درم
 آرزوئے جملہ تان را می خرم
 یک درم تان می شود چار المراد
 چار دشمن میشود یک ز اتحاد

(چار مختلف ملکوں کے چار آدمی یک جاتھے۔ ان میں ایک ایرانی تھا، ایک ترک تھا، ایک روم کا
 رہنے والا تھا اور ایک عرب تھا۔ انہیں ایک شخص نے ازراہ التفات ایک درم دیا۔ ان کے درمیان اس
 بات پر جھگڑا شروع ہوا کہ اس ایک درم کو کس کام میں خرچ کیا جائے۔ چنانچہ یہ مکالمہ ہوا:

ایرانی : انگور منگوائے جائیں۔
 عرب : ہرگز نہیں، بلکہ عنب خریدا جائے۔
 رومی : یہ بھی نہیں، بلکہ استافیل آنا چاہیے۔
 ترک : نہیں، یہ سب نہیں، بلکہ ازم منگوایا جائے۔

مولانا رومی اس حکایت کے ذریعے یہ باور کرانا چاہ رہے ہیں کہ چاروں اشخاص کا ہر ایک ہی
 ہے، یعنی انگور منگوانا۔ البتہ وہ اس کا نام اپنی اپنی زبان میں لے رہے ہیں اور ایک دوسرے کی زبان نہ

جاننے کی وجہ سے ان کے درمیان جھگڑا اور فساد برپا ہے۔ اگر یہ چاروں آدمی ایک دوسرے کی زبان سے واقف ہوتے تو پھر نزاع کی صورت نہ پیدا ہوتی۔ گویا مولانا نے اس واقعے کی صورت میں زبان دانی کی اہمیت اجاگر کر دی ہے اور موجودہ دور کی اس حقیقت کو طشت از بام کر دیا ہے کہ مختلف قبیلوں، قوموں اور علاقائی باشندوں کی زبان جاننے سے رشتہ اخوت ہموار ہوتا ہے اور باہمی تعلقات کی جڑیں مضبوط ہوتی ہیں۔

مذکورہ حکایت کی روشنی میں ہم اگر جائزہ لیں کہ کم از کم اسلامی ممالک میں بولی جانے والی زبانوں، مثلاً فارسی، ترکی، عربی، بنگلہ وغیرہ سے ہم کما حقہ واقف ہیں تو یقیناً جواب نفی میں ہوگا۔ اسی طرح پاکستان کی علاقائی زبانوں پنجابی، سندھی، پشتو، سرائیکی، ہندکو، براہوی، بلوچی وغیرہ سے ہم بخوبی آشنا ہیں تو اس کا جواب بھی حوصلہ شکن ہی ہوگا..... پھر قومی وحدت، قومی یک جہتی اور ملکی یگانگت کس طرح برقرار رہے گی۔ یہ ایک اہم سوالیہ نشان ہے اور مولانا روم کی اس حکایت میں اس کا شافی جواب مضمحل ہے۔

صرف یہی نہیں، زندگی کے متنوع پہلوؤں کو اور روزمرہ کے گونا گوں مسائل کو جس منطقی انداز اور موثر طریقے سے مولانا نے اپنی مثنوی میں پیش کر کے حل کرنے کی سعی کی ہے اور بھٹکے ہوئے راہی کو راستے کی پرخطر کھائیوں میں گرنے سے بچانے کے لیے استدلالی، اخلاقی، سماجی، مذہبی اور روحانی طرز تکلم اختیار کیا ہے اور جنسی بے راہ روی سے محفوظ رکھنے کا نفسیاتی طریقہ استعمال کیا ہے، وہ ایک احسانِ عظیم ہے انسان پر، انسانیت پر اور جملہ اقوام و ملل پر! اس طرح ان کا مقام حد درجہ ارفع و اعلیٰ بن گیا ہے اور ”مثنوی معنوی“ مندرجہ ذیل اعزاز کی فی الواقع اہل ہے:

ہست قرآن در زبان پہلوی

اقبال، مسجد قرطبہ اور مولانا روم

پیر رومی خاک را اکسیر کرد
از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد

ز رومی گیر اسرار فقیری
کہ آن فقر است محسود امیری

پیر رومی آں امامِ راستان
آشنائے ہر مقامِ راستان
(اقبال)

علامہ اقبال کے مذکورہ بالا اشعار اس حقیقت کا برملا اظہار کر رہے ہیں کہ انہیں مولانا جلال الدین رومی سے اس درجہ عقیدت تھی جو ایک مرید کو پیر سے ہوا کرتی ہے۔ اور یہ بات اقبالیات کے ماہرین بخوبی جانتے ہیں کہ علامہ نے ”مثنوی معنوی“ کے خالق کو ہمیشہ ”پیر رومی“ کے عقیدت مندانہ لہجے سے مخاطب کیا۔ پھر موصوف نے نہ صرف فکر رومی کی روشنی میں اپنا سخنورانہ سفر طے کیا بلکہ اپنے اردو اور فارسی کلام کے ذریعے مولانا روم کے بلند و بالا نظریات اور ارفع و اعلیٰ خیالات کی تبلیغ

بھی کی۔ ہم انہیں بلاشک و شبہ ”ترجمانِ رومی“ اور ”مفسرِ رومی“ قرار دے سکتے ہیں۔
 علامہ اقبال کو مولانا سے اس درجہ عقیدت تھی کہ اپنی وفات سے قبل (1935 میں) حکیم محمد حسین کو ایک خط لکھ کر اس جانب یوں اشارہ کیا ہے؟

”میں ایک مدت سے مطالعہ کتب ترک کر چکا ہوں۔ اگر کبھی پڑھتا ہوں تو صرف قرآن یا
 مثنوی رومی۔“

غور کیجیے کہ پوری دنیائے اسلام میں علامہ کی شاعری نشاۃ الثانیہ کا درجہ رکھتی ہے۔ وہ خود فکر
 اسلامی کے مسلم الثبوت داعی تھے۔ قرآن حکیم کا مطالعہ ہمیشہ ان کا معمولِ زندگی رہا۔ اور زندگی کے
 آخری برسوں میں جب کبھی مطالعہ کی سکت ہوئی تو قرآن پڑھا یا مثنوی معنوی!..... آخر علامہ کو مثنوی
 سے اس درجہ شغف کیوں تھا کہ اس کے پیش کردہ نظریے کی نہ صرف پیروی کی بلکہ وہ پیغامِ رومی کے
 بقول ڈاکٹر سید عبداللہ ”نہایت ہی مؤثر پرچارک قرار پائے۔“ اس عقیدت و ارادت کی تمام توجہ ایک
 خواب ہے، جس کا ذکر علامہ نے بقول مولانا صلاح الدین احمد اس طرح کیا تھا:

”مجھے خواب میں مولانا نے روم کی مثنوی پڑھنے کی باقاعدہ ہدایت ہوئی تھی۔“

مذکورہ بالا خواب سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ موصوف کو باقاعدہ اس بات کی ہدایت ہوئی
 تھی کہ وہ مثنوی معنوی کا بطور خاص مطالعہ کریں۔ لیکن اقبالیات کے ماہرین کو اس حقیقت کا تاہنوز
 اندازہ نہ ہو سکا کہ علامہ نے یہ خواب کہاں دیکھا، کس طرح دیکھا اور کیوں کر دیکھا۔ راقم الحروف نے
 اس ضمن میں روزنامہ ”جنگ“ میں ایک طویل مضمون لکھا تھا اور مذکورہ خواب اقبال کا ذکر ایک ایسے راوی
 کی وساطت سے کیا تھا جو ہر طرح قابل اعتماد تھا۔ طرفہ تماشایہ کہ اقبالیات کے مرد میدان اور علامہ
 اقبال اوپن یونیورسٹی میں شعبہ اقبالیات کے سابق چیئر مین ڈاکٹر رحیم بخش شاہین مرحوم نے اپنی
 تصنیف ”اوراقِ گم گشتہ“ میں اسے من و عن نقل کر دیا تھا۔ علامہ اقبال کے فرزند رشید ڈاکٹر جاوید اقبال
 نے میرے اسی مضمون کو روزنامہ ”جنگ“ سے اپنی کتاب ”زندہ رود“ میں نقل کر کے یہ حکم لگایا تھا کہ یہ
 واقعہ غلط ہے۔ میں یہاں صرف اتنا عرض کروں گا کہ روایت اور روایت کی بنیاد پر پوری اسلامی تاریخ کا
 ڈھانچہ کھڑا ہے، تو پھر مسجدِ قرطبہ کا واقعہ اور خواب میں مولانا نے روم کی آمد و تلقین سے لا تعلق آخر

کیوں؟ پھر، علامہ خود بھی خواب کے ذریعے مطالعہ رومی کے لیے دی جانے والی ہدایت کا برملا ذکر کر رہے ہیں۔ اب فیصلہ قارئین خود کریں گے کہ کیا پروفیسر امتیاز محمد خان جیسا مورخ اور ماہر تعلیم غلط بیانی سے بھی کام لے سکتا ہے۔ بہر حال مذکورہ مضمون پیش خدمت ہے۔

○○○

قرطبہ سے کون واقف نہیں۔ یہی وہ شہر تھا جہاں مسلمانوں کی عظمت و سطوت کا پرچم سات سو سال تک نہایت آن بان کے ساتھ لہراتا رہا۔ یہی وہ مقام تھا جہاں سے علم کی روشنی پھوٹی تھی اور اکتساب نور کے لیے یورپ جیسے تیرہ و تار خطے سے لوگ جوق در جوق آیا کرتے تھے۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں اسلامی تہذیب و تمدن کے چشمے رواں تھے۔ یہی وہ علاقہ تھا جہاں فکر و فن کے ان گنت ستارے جھلملاتے تھے۔

اسی قرطبہ میں ایک ایسی عظیم الشان مسجد تعمیر کی گئی تھی جس کی مثال پورے کرۃ ارض میں کہیں نہیں ملتی۔ فن تعمیر کا یہ وہ شاہکار ہے جس پر خود انسان خیران و ششدر دکھائی دیتا ہے۔ اسی مسجد سے متعلق علامہ اقبال کی ایک معرکہ الآرا نظم ”بال جبریل“ میں شامل ہے جسے انہوں نے بقول خود

”ہسپانیہ کی زمین بالخصوص قرطبہ میں لکھی۔“

علامہ اقبال کو قرطبہ جانے کا اتفاق 1933ء میں ہوا تھا۔ تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کی غرض سے جب وہ 1932ء میں لندن گئے تھے، وہیں سے پیرس ہوتے ہوئے ہسپانیہ بھی پہنچے تھے۔ اسی سفر کے دوران وہ قرطبہ تشریف لے گئے تھے اور وہاں اسلامی دور اقتدار کی زندہ و تابندہ نشانی مسجد قرطبہ دیکھی۔ مشہور ہے کہ علامہ اقبال نے مسجد قرطبہ میں اذان دی تھی اور نماز بھی پڑھی تھی۔ اس ضمن میں علامہ کے ایک دیرینہ نیاز مند فقیر سید وحید الدین اپنی کتاب ”روزگار فقیر“ (حصہ دوم) میں لکھتے ہیں:

”حکیم الامت علامہ اقبال تیسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس سے فارغ ہونے کے بعد اسپین بھی گئے

اور وہاں اسلامی دور اقتدار ختم ہونے کے تقریباً سات سو سال بعد انہوں نے مسجد قرطبہ میں

پہلی بار اذان دی اور نماز پڑھی۔“ (ص 411)

فقیر وحید الدین کے مندرجہ بالا بیان کو پڑھنے کے بعد قاری یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اذان دینے اور نماز پڑھنے کا سارا عمل نہایت سکون و طمانیت کے ساتھ انجام پایا ہوگا، اور وہ بھی ایسی

صورت میں جبکہ مؤذن اور نمازی (اقبال) کا دل اسلام کی محبت سے سرشار تھا اور سامنے عظمتِ رفتہ کی منہ بولتی تصویر نظر آ رہی تھی۔ یہ مقدس فریضہ جس خشوع و خضوع کے ساتھ انجام پایا ہوگا، وہ اظہر من الشمس ہے۔

اردو کے مشہور صحافی، ادیب اور شاعر جناب عبدالمجید سالک اپنی کتاب ”ذکر اقبال“ میں اسی واقعے سے متعلق یوں رقمطراز ہیں:

”علامہ اقبال نے بے اختیار چاہا کہ مسجد قرطبہ میں تحیۃ المسجد کے نفل ادا کریں۔ اس عمارت کے نگران سے پوچھا۔ اس نے کہا میں بڑے پادری سے پوچھ آؤں۔ ادھر وہ پوچھنے گیا، ادھر علامہ نے نیت باندھ لی اور اس کے واپس آنے سے پہلے ہی پہلے نماز سے فارغ ہو گئے۔“ (ص 182)

عبدالمجید سالک صاحب کی تحریر سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ علامہ اقبال نے مسجد قرطبہ میں نماز بہ عجلت ادا کی، مبادا نگران آ کر انہیں اس کام سے روک دے۔

درج بالا دو واقعات کے بعد قاری لازماً الجھن میں پڑ جائے گا کہ کسے مانے اور کسے نہ مانے۔ پھر جبکہ علامہ کی ایک تصویر مسجد قرطبہ میں باقاعدہ مصلے پر بیٹھ کر نماز ادا کرتے ہوئے کھینچی گئی ہے۔ عالم عجلت میں تو اس طرح کی تصویر کشی آج سے 75/70 سال پہلے ممکن نہ تھی ع

پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

○○○

اسی ہنگامے کے پیش نظر آج میں مسجد قرطبہ میں علامہ اقبال کے باقاعدہ داخل ہونے، اذان دینے، نماز پڑھنے اور دوسرے اہم راز کے بارے میں ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔ علامہ اقبال نے خود یہ واقعہ جس شخص کو سنایا تھا، اور جس سے میں نے (دیگر افراد کے ساتھ¹) سنا، وہ کئی سال ہوئے اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اس واقعہ کی صداقت کے بارے میں صرف یہی عرض کیا جاسکتا ہے کہ اسے پروفیسر امتیاز محمد خاں جیسی شخصیت نے خود بیان کیا تھا۔

قارئین پوچھ سکتے ہیں کہ یہ امتیاز محمد خاں کون تھے؟ اس سلسلے میں عرض ہے کہ وہ آگرہ کے

1 ان افراد کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

رہنے والے تھے۔ لندن سے انہوں نے تاریخ میں بی اے (آنرز) اور ایم اے کی ڈگری لی تھی۔ وہاں سے واپسی کے بعد غیر منقسم ہندوستان کے مشہور علمی ادارے ریلوے ہائی اسکول، دانا پور (بہار) کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ واضح رہے کہ یہ وہ اسکول ہے جہاں جسٹس سید شرف الدین¹، سر علی امام²، حسین امام³ وغیرہ نے تعلیم پائی تھی۔

تقسیم ہند کے بعد خان صاحب موصوف بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح کی خصوصی ہدایت پر پاکستان آ گئے۔ انہیں حکومت نے کراچی اور بلوچستان کا ناظم تعلیمات مقرر کیا۔ خان صاحب ایک طویل عرصے تک بطور ناظم تعلیمات خدمات انجام دیتے رہے۔ سنہ ساٹھ کے ابتدائی عشرے میں قائد اعظم کی ہمیشہ محترمہ فاطمہ جناح نے انہیں جناح کالج کراچی کا پرنسپل مقرر کیا۔ وہ اس تعلیمی ادارے کی صدر تھیں اور جناح کالج کو معیاری بنانے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہیں۔

پروفیسر امتیاز محمد خاں کے بے شمار بصیرت افروز، محققانہ اور تاریخی نوعیت کے مضامین بابائے اردو مولوی عبدالحق نے انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی کے مشہور و معروف سہ ماہی مجلے ”اردو“ میں شائع کئے تھے، مثلاً

- دولت عثمانیہ کا نظم حکومت
- عہد عثمانیہ کے علمائے دین
- عثمانی ترکوں کے عہد میں فن مصوری

امتیاز محمد خاں مرحوم ایک مؤرخ اور ماہر تعلیم ہی نہ تھے، انہیں مثنوی مولانا نے روم سے بھی

1 جسٹس سید شرف الدین دانا پور سے قریب کی بستی نیورہ کے رہنے والے تھے اور اردو کے نامور محقق، شاعر، حکیم اور ”کاشف الحقائق“ کے مصنف نواب امداد امام اثر کے قریبی عزیز تھے۔ جسٹس صاحب کلکتہ اور پٹنہ ہائیکورٹ کے چیف جسٹس رہ چکے ہیں۔ یہ مشہور بزرگ حاجی وارث علی شاہ کے مرید تھے۔ سلسلہ وارثیہ کے ان بزرگ نے قتل کے ایک پیچیدہ مقدمے کا فیصلہ اس وقت ٹرین میں انہیں لکھوا دیا تھا جو جسٹس صاحب کے لیے سوہان روح بنا ہوا تھا۔ سید صاحب نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اس اجلاس کی صدارت کی تھی جو دسمبر 1906ء میں ڈھاکہ میں منعقد ہوا تھا اور جس کے اختتام پر آل انڈیا مسلم لیگ وجود میں آئی تھی۔ اس سے قبل لکھنؤ میں ایک مجلس منعقد ہوئی تھی۔ اس کی صدارت بھی جسٹس شرف الدین نے کی تھی۔ وہیں یہ طے ہوا تھا کہ کانگریس کے بالمقابل مسلمانوں کی بھی ایک سیاسی جماعت ہونی چاہیے۔ اس طرح مسلم لیگ کی تشکیل ہوئی جو قیام پاکستان کا سبب بنی۔

2 سر علی امام، نواب امداد امام اثر کے صاحبزادے اور نامور قانون دان تھے۔ پریوی کونسل کے ممبر منتخب ہوئے۔ ریاست حیدرآباد کے وزیر اعظم بھی رہے۔ مسلم لیگ کے سرگرم کارکن اور قائد اعظم کے عزیز دوست تھے۔

3 حسین امام، سر علی امام کے چھوٹے بھائی اور نامور قانون دان تھے۔

والہانہ لگاؤ تھا۔ فارسی داں ہونے کی وجہ سے وہ مثنوی معنوی کے جملہ اسرار و محاسن سے آگاہ تھے۔ جب فروری 1962ء میں، میں جناح کالج کی اُردو لیکچررشپ اور ”جناح کالج میگزین“ کی ادارت چھوڑ کر ڈاکٹر محمود حسین خاں کے قائم کردہ جامعہ تعلیم ملی کالج، بلیر (کراچی) جا رہا تھا، اس موقع پر خاں صاحب نے ازراہ شفقت ایک الوداعی تقریب کا اہتمام کیا تھا۔ اس موقع پر موصوف نے مولانا روم کی مثنوی کو فلم پر وجیکٹر کے ذریعے پیش کرنے کا خصوصی انتظام کیا تھا۔ وہ یوں کہ پردے پر نہایت خوش خط لکھی ہوئی مثنوی نمایاں ہوتی۔ اور ساتھ ہی ساتھ مشہور مفکر اور عالم دین مولانا شاہ جعفر پھلواری کی دلنشین آواز ابھرتی اور ہر مصرع کانوں میں رس گھولتا ہوا محسوس ہوتا۔ گویا سعی و بصری دونوں طرح سے مثنوی مولانا روم حاضرین کو مسحور کر رہی تھی۔ پروفیسر امتیاز محمد خان نے مولانا جلال الدین رومی کے شہکار کو اثر انگیز انداز میں پیش کرنے کی طرح ڈالی تھی۔

میں یہاں یہ بتانا چلوں کہ وہ رمضان کا مہینہ تھا۔ جناح کالج کے وسیع ہال میں افطار اور کھانا، دونوں کا بندوبست کیا گیا تھا۔ اس تقریب میں جناح کالج کے اساتذہ اور بعض ذہین اور سینئر طلبا بھی شریک تھے۔ اس موقع پر امتیاز محمد خاں صاحب نے مسجد قرطبہ کے حوالے سے علامہ محمد اقبال کا جو ذکر کیا تھا، اس کے سامعین میں مندرجہ ذیل حضرات بھی شامل تھے:

- 1 میاں ریاض الدین، جناح کالج کے سیکرٹری۔
- 2 سلمان احمد علی (لیکچرر انگریزی)۔ اس وقت کراچی کی ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی کے مالک ہیں۔
- 3 شیخ وقار حسین (لیکچرر سائنس)۔ اس وقت نیشنل کالج کراچی کے پرنسپل ہیں۔
- 4 سید ایم انور (لیکچرر، پولیٹیکل سائنس) اس وقت کراچی میں میگراہل بک کارپوریشن کے ریجنل منیجر ہیں۔

5 نصیر ترابی (سال دوئم کے طالب علم)۔ مشہور دینی شخصیت علامہ رشید ترابی کے صاحبزادے اور

1 مولانا شاہ جعفر پھلواری صوبہ بہار کے ایک قدیم اور تاریخی شہر پھلواری کے رہنے والے تھے۔ آپ وقت کے جید عالم دین اور صوفی باصفا شاہ سلیمان پھلواری کے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ واضح رہے کہ انیسویں صدی عیسوی کے اواخر اور بیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں شاہ سلیمان پھلواری نے تقریر اور وعظ کے ذریعے آنحضرت ﷺ کی سیرت مبارکہ کو بیان کرنے کی طرح ڈالی تھی اور پورے برصغیر میں آپ اس خدمت کے بدولت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ علامہ اقبال اور شاہ سلیمان پھلواری کے مابین گہرے مراسم تھے۔ دینی مسائل کے ضمن میں جب بھی کسی دشواری کا سامنا ہوتا، علامہ اقبال حضرت شاہ صاحب سے رجوع کرتے۔ تقسیم کے بعد شاہ جعفر پھلواری لاہور آ گئے تھے۔ مشہور صحافی اور موثر عالم اسلامی پاکستان کے صدر مولانا حسن ثنی ندوی شاہ جعفر کے بڑے بھائی حسن میاں کے فرزند تھے۔

اُردو کے خوشگوشاعر۔

6 منورغنی (ڈیپونسٹریٹر) وکالت کا امتحان پاس کرنے کے بعد جسٹس نور العارفین کے ساتھ کام کیا۔ اس وقت کراچی کے مشہور وکیل ہیں۔

مذکورہ دعوت کے موقع پر کراچی وکونٹہ کے پہلے ناظم تعلیمات اور جناح کالج کے پرنسپل امتیاز محمد خاں نے گفتگو کرتے ہوئے فرمایا:

”علامہ اقبال نے بھی مثنوی مولانا روم بغور پڑھی تھی اور اس کا اثر قبول کرنا لازمی تھا۔ یہ بات تو صحیح ہے۔ مگر اس سلسلے میں ایک اہم راز بھی پوشیدہ ہے۔ آئیے، آج میں آپ کو علامہ اقبال کی زندگی کا یہ راز بتاتا ہوں۔“

اتنا کہنے کے بعد خان صاحب نے مجمع پر ایک مشفقانہ نظر ڈالی اور یوں گویا ہوئے:

”مجھے مثنوی مولانا روم سے طالب علمی کے زمانے سے ہی شغف رہا ہے۔ جب میں نے علامہ اقبال کے اُردو اور فارسی کلام کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا تو وہاں بھی یہی رنگ غالب نظر آیا۔ لہذا مجھے علامہ سے بھی بے پناہ عقیدت ہو گئی۔ جب میں نے علامہ سے ان کی زندگی کے آخری دنوں میں ملاقات کی تو دوران گفتگو مولانا روم کا ذکر آیا، ان کی مثنوی معنوی کا تذکرہ ہوا اور پھر اقبال کی شاعری پر ان سب کے اثرات کی بات چل نکلی۔ اس موقع پر علامہ نے اپنی زندگی کی ایک ایسی حقیقت کا اظہار کیا جس کا تذکرہ نہ کسی کتاب میں ملتا ہے نہ کسی مضمون نگار نے کہیں ذکر کیا ہے۔“

اتنا کہنے کے بعد پاکستان کے ماہر تعلیم، مؤرخ اور ذی قدر استاد امتیاز محمد خاں مرحوم نے علامہ اقبال کی زبانی رمضان المبارک کے آخری عشرے کی رات جو واقعہ بیان کیا تھا اور جس کے سامع و شاہد آج بھی کراچی میں موجود ہیں، اسے میں یہاں من و عن تحریر کر رہا ہوں:

”جب میں تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن گیا تو اس دوران سفر میرا بے طرح جی چاہا کہ اسلامی دور کی قدیم نشانی اسپین کو بھی جادیکھوں، خصوصاً الحمراء اور مسجد قرطبہ کی پُر شکوہ عمارت کا مشاہدہ بھی کروں۔ یہ خیال آتا تھا کہ دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ مسجد قرطبہ کو دیکھنے کا موقع تو مل جائے گا مگر وہاں نماز کس طرح ادا کر سکوں گا۔ اس لیے کہ جب ہسپانیہ میں غیر مسلموں کی حکومت قائم ہوئی اور ایک دوسرا آئین نافذ ہوا تو وہاں کا پہلا قانون یہ تھا

کہ مسجد قرطبہ میں نہ تو اذان دی جائے گی نہ ہی نماز ادا کی جائے گی اور اسی قانون کے نفاذ کے بعد اس عظیم الشان مسجد کو گر جا بنا دیا گیا۔“

یہ کہنے کے بعد امتیاز محمد خاں صاحب ر کے، چائے کی چسکی لی اور علامہ کی بات دہرانے لگے:

”اس قانون کا خیال آتے ہی دل رونے لگا۔ میں مسجد میں داخل ہو کر بھی دو رکعت نماز تک ادا نہ کر سوں گا۔ اس سلسلے میں، میں نے ایک انگریز دوست کی مدد حاصل کی۔ اس نے حکومت ہند کے ہوم سیکرٹری کو خط لکھا اور اس سے درخواست کی کہ وہ حکومت ہسپانیہ کے ہوم سیکرٹری کو خط لکھ کر اس بات کی اجازت حاصل کرے کہ ڈاکٹر محمد اقبال سفر قرطبہ کے دوران مسجد قرطبہ میں باقاعدہ نماز ادا کر سکے۔ چنانچہ یہ کوشش بار آور ثابت ہوئی اور مجھے اجازت مل گئی۔ مگر ایک شرط کے ساتھ! قانون، قانون ہوتا ہے۔ اس کو توڑنا بھی آسان نہیں! لہذا یہ طے پایا کہ جب میں مسجد قرطبہ کے اندر داخل ہو جاؤں تو دروازہ بند کر دیا جائے اور اس پر قفل لگا دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔“

مسجد کے اندر داخل ہو کر میں نے اپنی آواز کی پوری شدت کے ساتھ اذان دی۔ میں اس جذبے، اس سرور اور اس کیف کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ سالہا سال کے بعد مسجد قرطبہ کے اندر پہلی مرتبہ اللہ اکبر کی آواز محراب و منبر سے ٹکرائی اور گونج رہی تھی۔

اذان سے فارغ ہونے کے بعد میں نے مصیبتی بچھایا اور نماز ادا کرنے لگا۔ دوران نماز مجھ پر اس قدر رقت طاری ہوئی کہ میں گریہ و زاری برداشت نہ کر سکا اور جب سجدے میں گرا تو بے ہوش ہو گیا۔ اسی دوران میں نے عالم رویا میں دیکھا کہ ایک بزرگ تشریف لائے ہیں اور مجھے مخاطب کر کے کہہ رہے ہیں:

”اقبال! تم نے میری مثنوی کا بغور مطالعہ نہیں کیا۔ اسے مسلسل

پڑھتے رہو اور میرا پیغام دوسروں تک پہنچاؤ۔“

جب میں ہوش میں آیا تو دل کو سکون حاصل ہو چکا تھا..... اس کے بعد میں تھا اور مطالعہ مثنوی

مولانا روم!

علامہ اقبال کی زبانی ان کا یہ اہم واقعہ بیان کرنے کے بعد امتیاز محمد خاں مرحوم یگانگت خاموش

ہو گئے۔ اس وقت ان کی آنکھیں آنسوؤں سے پرتھیں ع

دل کو کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں!

قلم کاروں کا خراج عقیدت

مولانا جلال الدین رومی سے اکتسابِ نور کرنے والے، ایک نہیں ہزار تھے۔ ہر زمانے میں قلم کاروں نے مولوی معنوی کے حضور دل کی اتھاہ گہرائیوں سے خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ یہ دراصل اس جذبہِ خلوص کا مظہر ہے جو قونیہ کے اس شاعرِ بے بدل کے لیے ان سمجھوں کے نہاں خانہِ دل میں موجزن رہا ہے۔ یہ بھی گویا مولانا کی سر بلندی کا ایک راز ہے کہ ہر قوم، ہر فرقہ، ہر ملک اور ہر دیار کے رہنے والے قلم کاروں نے موصوف کی ذاتِ گرامی، اُن کے ارفع و اعلیٰ نظریات اور اُن کے پیش کردہ اشعار کی معنویت، وسعت اور حساسیت سے متاثر ہو کر نذرانہِ خلوص پیش کیا ہے۔ ایسے تاثرات بے شمار ہیں، لیکن تنگ دامانی کتاب کے پیش نظر چند ایک بطور نمونہ از خرد وارے پیش کئے جا رہے ہیں:

علامہ شبلی نعمانی

کسی کتاب کی مقبولیت دو طریقوں سے ہوتی ہے۔ کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ سادگی اور صفائی اور عام دلآویزی کی وجہ سے پہلے وہ کتاب عوام میں پھیلتی ہے، پھر رفتہ رفتہ خواص بھی اس کی طرف توجہ کرتے ہیں اور مقبول عام ہو جاتی ہے۔ کبھی یہ ہوتا ہے کہ کتاب عوام کی دسترس سے باہر ہوتی ہے، اس لئے صرف خواص کی نظر پڑتی ہے۔ خواص جس قدر زیادہ اس پر توجہ کرتے ہیں، اسی قدر اس میں زیادہ نکات

اور دقائق پیدا ہو جاتے ہیں۔ خواص کی توجہ اور اعتنا و تحسین کی وجہ سے عوام میں بھی چرچا پھیلتا ہے اور لوگ تقلید اس کے معتقد اور معترف ہوتے ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ دائرہ تمام ملک کو محیط ہو جاتا ہے۔ مثنوی کی مقبولیت اسی قسم کی ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ اس قسم کی مقبولیت اور کسی کتاب کو حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔

فارسی زبان میں جس قدر کتابیں نظم و نثر میں لکھی گئی ہیں، کسی میں ایسے دقیق، نازک اور عظیم الشان مسائل اور اسرار نہیں مل سکتے جو مثنوی میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

فارسی پر موقوف نہیں، اس قسم کے نکات اور دقائق کا عربی تصنیفات میں بھی مشکل سے پتہ لگتا ہے۔ اس لحاظ سے اگر علماء اور ارباب فن نے مثنوی کی طرف تمام کتابوں کی نسبت زیادہ توجہ کی اور یہاں تک مبالغہ کیا کہ ”ہست قرآن در زبان پہلوی“ تو کچھ تعجب کی بات نہیں۔

رضازادہ شفق

مشرق و مغرب کے ناقدوں کی رائے کے مطابق مولانا رومی غالباً دنیا کے اور یقیناً ایران کے سب سے بڑے صوفی شاعر ہیں۔ ان کا دیوان غزلیات جو دیوان شمس تبریز کے نام سے مشہور ہے، عشقیہ اور عرفانی کیفیات سے پُر ہے۔ غزلیات میں عرفانی اور صوفیانہ نکات جا بجا نظر آتے ہیں۔ لیکن مولانا کی صوفیانہ شاعری اور ان کی عظمت ان کی مشہور و معروف مثنوی کے باعث ہے۔

مثنوی مغوی مولانا جلال الدین کے افکار گراں بہا کا ثمرہ اور ان کے اشعار کا بہترین مجموعہ ہے۔ بلکہ یہ فارسی زبان میں تصوف کا مکمل ترین دیوان ہے۔ اس میں چھ دفتر ہیں اور اشعار کی تعداد چھبیس ہزار ہے جو بحرِ ثل میں کہے گئے ہیں۔

مقبول بیگ درخستانی

مولانا روم کی مثنوی سے پہلے کی مثنویوں میں عموماً یہ طریق اختیار کیا جاتا کہ عنوان قائم کر کے اس پر اظہار خیال کیا جاتا تھا اور موضوع و مضمون کی وضاحت کے لیے حکایات بیان کی جاتیں۔ حکیم سنائی اور خواجہ عطار کا یہی انداز ہے۔ لیکن مثنوی رومی میں اس طرح کی ترتیب نہیں۔ دفتروں کی تقسیم موضوعات کے لحاظ سے نہیں کی گئی ہے۔ مولانا روم تمام حکایت شروع کر دیتے ہیں اور جہاں موقع ملتا

ہے، عرفانی نکات پیش کر دیتے ہیں۔ بعض اوقات حکایت بیان کی جا رہی ہوتی ہے اور درمیان میں طویل عرفانی مضامین بیان کر دیئے جاتے ہیں۔ ان کے بعد پھر حکایت جاری رہتی ہے۔ اس طرح قاری حکایت کی دلچسپی میں اصل مقصود کو بھی پالیتا ہے۔

مثنوی کی سب سے بڑی خصوصیت مولانا کا طرز استدلال ہے۔ وہ مشکل اور عمیق موضوعات اور مضامین کو حکایتوں، تمثیلوں اور تشبیہوں سے قارئین پر روشن کر دیتے ہیں۔

مولانا ہدایت و تعلیم کو سخن پردازی اور شاعری سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ ان کے پیش نظر عالم و عارف بھی ہیں اور مبتدی و عامی بھی! اس لیے وہ زبان ایسی استعمال کرتے ہیں جو سب کی سمجھ میں آسکے۔ نیز، مولانا نے اپنے فلسفیانہ شعور اور شاعرانہ صلاحیتوں کی بدولت اس طریق تعلیم کو کمال کے مرتبے تک پہنچایا۔

علامہ اقبال

مرشد رومی حکیم پاک زاد سر مرگ و زندگی بر ما کشاد

پیر رومی خاک را اکسیر کرد از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد

پیر رومی مرشد روشن ضمیر کاروانِ عشق و مستی را امیر

نور قرآن در میانِ سینہ اش جامِ جم شرمندہ از آئینہ اش

راز معنی مرشد رومی کشود فکر من پر آسائش در سجود

پیر رومی را رفیقِ راہ ساز تا خدا بخشد ترا سوز و گداز

شرح او کردند و او را کس ندید معنی او چوں غزال از ما رمید

رقص تن از حرف او آموختند چشم را از رقص جان بردوختند

گتہ تار ہے تیری خود کا ساز اب تک کہ تو ہے نغمہ رومی سے بے نیاز اب تک

صحبت پیر روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سر بجیب ایک کلیم سر بہ کف

تو بھی ہے اسی قافلہ شوق میں اقبال
جس قافلہ شوق کا سالار ہے رومی
ہم خوگر محسوس ہیں ساحل کے خریدار
اک بحر پُر آشوب و پُر اسرار ہے رومی

مرا بنگر کہ در ہندوستان نئے بنی
برہمن زادہ رمز آشنائے روم و تبریزست

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گلِ ایراں، وہی تبریز ہے ساقی

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں

مثنوی کی سلاست، روانی اور برجستگی کا یہ عالم ہے کہ اس کے بعد بکثرت شعراء نے اس کا تتبع کیا اور علامہ اقبال نے خاص طور پر اس مثنوی کی پیروی میں کئی مثنویاں لکھیں اور اس مثنوی سے متاثر ہو کر انہوں نے اپنے ”فلسفہ سخت کوشی“ کی تبلیغ بھی کی۔ علامہ اقبال کی مثنوی ”اسرار خودی“ جو مولانا ہی کی زمین میں ہے، مولانا کے دیوان کے ان اشعار سے شروع ہوتی ہے۔

دی شیخ با چراغ ہی گشت گرد شہر
کنہ دام و دو ملولم و انسانم آرزو ست
زین ہمرہان ست عناصر دلم گرفت
شیر خدا و رستم دستانم آرزو ست
گفتم کہ یافت می نشود جتہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزو ست

یعنی کل ایک بزرگ دن کے وقت چراغ لیے گھوم رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ میں حیوانوں سے تنگ آ گیا ہوں اور میں انسانوں کو ڈھونڈتا ہوں۔ میں اپنے سست ساتھیوں سے تنگ آ گیا ہوں اور میں شیر خدا اور رستم کی تلاش کر رہا ہوں۔

لوگوں نے کہا ہم تو بہت ڈھونڈ چکے، انسان تو کہیں ملتا نہیں۔ وہ بزرگ بولا کہ ”جو نہیں ملتا اسی کو تو ڈھونڈتا ہوں۔“ چنانچہ یہی سخت کوشی، پیہم جستجو، مسلسل تلاش رومی کا خاص پیام ہے۔ جس کا خلاصہ ایک مصرع میں آ گیا ہے ع

کوشش بے ہودہ بہ از خفتگی

یعنی اگر یہ بھی معلوم ہو کہ اب کوشش کرنے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا تب بھی کوشش کرنی چاہیے جو سورہنے سے بہتر ہے۔ یعنی زندگی اور زندہ رہنے کا ثبوت ہی کوشش میں مصروف رہنا ہے۔

پروفیسر سید عابد علی عابد

یہی مثنوی کا موقف ہے کہ شریعت اور طریقت میں کوئی فرق نہیں، یہ ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ مولانا روم نے شخصاً تمام احکام شرعی کی پابندی کر کے صحیح تصوف کی حد بندی کر دی اور یہ بات اچھی طرح واضح کر دی کہ جو صوفی احکام شریعت پر عمل نہیں کرتا، وہ اپنے قلب کے مجلی ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اگر واقعی اس کا قلب ہوتا تو تمام احکام شریعی کی پابندی وہ اپنے لیے لازم قرار دیتا۔

مولانا روم کی مثنوی کے بعد متصوفانہ شاعری میں کسی نئی اہم چیز کا اضافہ نہیں ہوا۔ جامی

تک وہی اسرار و رموز دہرائے جاتے رہے جو مثنوی میں پائے جاتے ہیں۔ یہی مثنوی کے تفوق کی دلیل قطعی ہے۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

مولانا جلال الدین رومی تشبیہ و تمثیل کے بادشاہ ہیں۔ وہ اخلاقی و روحانی مسائل کو سلجھانے کے لیے اگرچہ ایک حد تک منطقی استدلال بھی کرتے ہیں، لیکن جب وہ کسی تشبیہ یا مثال کے ذریعے سے مطلب کو واضح کرتے ہیں تو بات زیادہ دلنشین اور یقین آفریں ہوتی ہے۔

ان کی مثنوی حکمت و عرفان کا بحرِ ذخار ہے۔ اور ان کے بیان میں استدلال اور ذاتی وجدان ہم آغوش ہیں اور فطرت نے ان کو یہ غیر معمولی ملکہ عطا کیا ہے کہ ہر بار یک نکتے کی وضاحت کے لیے ان کو دلنشین تشبیہ سوجھتی ہے جو یقین آفریں بھی ہوتی ہے اور وجد آور بھی!

ڈاکٹر قاسم صافی

سیاسی اور جغرافیائی تبدیلیاں افکار مثنوی کی اشاعت اور دنیا میں مولانا کے اثر و رسوخ کے پھیلنے میں مانع نہ ہو سکیں۔ مولانا کے آثار نے سب سے زیادہ برصغیر کو متاثر کیا۔ بلا مبالغہ برصغیر کی جتنی زبانوں میں مثنوی کی شرحیں ہوئیں، دنیا کی کسی اور زبان میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ مولانا کے عرفانی کمالات اس علاقے کے لوگوں کے لیے جواں مردی اور اخلاقی شہسواری کے لیے مثال بنے اور انہوں نے تین لحاظ سے اس خطے کے لوگوں کو متاثر کیا:

- 1- زندگی، اخلاق اور تصوف میں مخصوص طرز۔
- 2- افکار مولانا جو فطرت انسانی کے نمائندہ ہیں۔
- 3- مثنوی شریف۔

مولانا صلاح الدین احمد

مولانا رومی کے یہاں چہرہ محبوب ماہ نہیں، مہر ہے، چاند نہیں بلکہ سورج ہے۔ اور اس تصور میں

زندگی کی وہ تمام کیفیات حرارت و وحدت موجود ہیں جو آفتاب سے خاص ہیں۔ دوسرا یہ کہ انسان ذاتِ باری سے وہی نسبت تعلق رکھتا ہے جو ذرے کو آفتاب کے ساتھ ہے۔ اور تیسرا یہ کہ عشق براہ راست اس سرچشمہ نور و حرارت سے مستیز ہے جس نے خود آفتاب کو بخشی اور اسے زندگی کا خالق و رہنما بنایا۔ اور چوتھا یہ کہ رومی کے یہاں ذات، موت کی اور روز روشن صحیح طور پر زندگی کی علامت اور اس کے ہم معنی ہے۔

ڈاکٹر محمد اکرم

عام صوفیاء نے فنا اور ترک دنیا پر زور دینا تعلیم کا مقصود بنا لیا تھا۔ مولانا روم نے اس کو بقا اور ارتقا کے نظریے سے بدل دیا۔ رومی کے ہاں خودی کا استحکام لازمی ہے۔ ان کا طریقہ قوتِ تسخیر میں اضافہ کرتا ہے۔ عجمی تصوف نے ترک حاجات کو خدا رسی قرار دیا تھا۔ رومی کہتے ہیں کہ حاجت تو مصدر وجود اور منبع بہبود ہے۔ خدا کی خوبی ہے کہ بے نیاز ہے۔ بندے کی بندگی حاجاتِ طلبی سے وابستہ ہے۔ لیکن رومی اس بات کی تعلیم دیتے ہیں کہ حاجات پست اور حیات کش نہ ہوں۔ زندگی کے تقاضے بلند ہونے چاہئیں۔ رومی اس خیال کی تائید کرتے ہیں کہ خدا نے زمین و آسمان عبث نہیں پیدا کئے بلکہ کسی حاجت ہی سے کیے ہیں۔

ون فیلڈ

مثنوی نظری تصوف کا کوئی رسالہ نہیں بلکہ عملی تصوف کی ایک تفسیر ہے۔ چنانچہ رومی اس ساری صوفیانہ روحانیت کی نمائش اس منطقی صحت کے ساتھ نہیں کرتے جس طرح کوئی باضابطہ مفکر کرتا ہے بلکہ وہ فرض کر لیتے ہیں کہ قارئین یہ سب کچھ خوب جانتے ہیں۔

آر۔ اے۔ نکلسن

فارسی کے شعری ادب میں اعلیٰ درجے کے صوفیانہ مضامین کا اظہار رومی کے توسط سے بروئے کار آیا۔ صوفیانہ شاعری کے وسیع تناظر میں رومی ایک پُر وقار پہاڑی قلعہ کی طرح ایستادہ نظر آتے ہیں جبکہ ان سے قبل کے اور بعد کے دوسرے متعدد شعراء ان کے مقابلے میں دامنِ کوہ کے مکین دکھائی دیتے

ہیں۔ رومی کی قائم کردہ مثال حد درجہ جاذب توجہ ثابت ہوئی ہے۔ ان کی فکر اور زبان کا اثر ان کے بعد کی آنے والی صدیوں میں شدت سے محسوس کیا گیا۔ پھر تو ہر صوفی جو فارسی زبان سے واقف تھا، ان کی عظمت کو تسلیم کرنے لگا۔

ای۔ جی۔ براؤن

جلال الدین رومی خاکِ ایران سے اٹھنے والے بلاشبہ ممتاز ترین صوفی شاعر ہیں۔ ان کی صوفیانہ ”مثنوی“ دوامی حیثیت کی عظیم نظموں میں شمار کیے جانے کے لائق ہے۔

اے۔ جی۔ آربری

عظمتِ رومی کے سلسلے میں بے شمار کلمہ ہائے تحسین پیش کیے گئے ہیں۔ ان کی عظمت کا اعتراف مغرب میں بھی اسی قدر کیا گیا ہے جس قدر مشرق میں! رومی نے انسانیت کو اپنے رفیع المرتبت اور عظیم الشان سرمایہ ادب و فکر سے مالا مال کر دیا تھا۔

جوناتھن سٹار

صوفیانہ ادب میں رومی کی شاعرانہ اور روحانی خدمات قابل یادگار ہیں۔ انہوں نے اپنی وسیع تخلیقات کے ذریعے نہ صرف اسلامی تصوف کو بہ حسن و خوبی اجاگر کیا ہے بلکہ اسے نکھارا اور سنوارا ہے اور سرور انگیز حسن کی صورت عطا کی ہے۔ انہوں نے جو ذاتی تجربات پیش کیے ہیں وہ آفاقی صداقت کے آئینہ دار ہیں..... یعنی عام انسان کی زندگی جو ہمہ گیر بھی ہے، مصروف کار بھی ہے اور ناقابل یقین حوادث سے پُر بھی ہے۔ رومی کی نظر میں یہ سب کچھ ذاتِ باری تعالیٰ تک رسائی کے سفر کے نہایت ضروری لوازمات ہیں۔ پھر، رومی نے ہر لفظ کو زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ جو کوئی ان کے اشعار کا مطالعہ کرتا ہے وہ روح کے عریاں ہیئت کا نظارہ کر لیتا ہے جو حیات کے لباس میں ملفوف ہے۔

ہم رومی کے کلام میں عشق و محبت کی سچی آواز کی گونج سنتے ہیں۔ ہم اس میں عاشق و معشوق کے درمیان ہونے والی سرگوشی کو سن لیتے ہیں۔ ہم اس مسرور دل کو بخوبی محسوس کر لیتے ہیں جو اپنے ہی

وجود کے گھلتے ہوئے مادے پر رواں دواں ہے۔

کول مین بارک

رومی کی یہ نظمیں مغرب کے وضع کردہ یادگاری لمحات کی مانند نہیں۔ نہ ہی یہ جدا جدا رنگ و آہنگ پر مبنی عناصر کا مرکز ہے..... بلکہ یہ تو ایک سیال شے ہے جو مسلسل اپنی ہیئت تبدیل کرتا رہتا ہے، جو اپنے وجود کی خبر دیتا رہتا ہے۔

آپ اسے روشن خیالی کا نام دے سکتے ہیں، محبت کی سرشاری قرار دے سکتے ہیں، اسے روح، صداقت اور علم کا سمندر قرار دے سکتے ہیں یا پھر آکسٹ..... کا مظہر تجویز کر سکتے ہیں۔ نام میں کیا رکھا ہے۔ ہر ذی نفس میں ایک سمندر موجزن ہے۔ رومی کی شاعری اسی سمندر کے اندر سے آتی ہوئی نمکین ہوا ہے جو خشکی کی جانب سفر کر رہی ہے۔

ہارپر سین

ہم جو موجودہ دور کے تھکے تھکے سے لوگ ہیں، صرف رومی سے محبت ہی نہیں کرتے بلکہ رومی نے جس کسی سے خود محبت کی ہے، اس سے بھی محبت کرنے لگتے ہیں۔

جیک کورن فیلڈ

رومی دنیا کے عظیم صوفی شاعر ہیں۔ ان کے اشعار سے سنہری شعاعیں جلوہ فگن ہوتی ہیں۔

ہسٹن اسمتھ

آج امریکہ میں رومی سب سے زیادہ پڑھے جانے والے شاعر ہیں۔

○○○

زیر نظر باب کے آخر میں راقم الحروف خود مولانا جلال الدین رومی کے فرزند اکبر سلطان ولد کی مثنوی ”ولد نامہ“ کا ایک اقتباس پیش کرنا چاہ رہا ہے۔ مذکورہ بالا قلم کاروں نے مولانا کے روم کی

شاعری اور فکری زاویے کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے اپنے تاثرات قلمبند کیے ہیں، لیکن سلطان ولد نے اُس دور کی سچی تصویر پیش کی ہے، جب شمس تبریز سے ملاقات کے بعد ان کی زندگی کا ایک نیا رنگ سامنے آیا تھا۔ رقص و سماع ان کا لازمہ حیات بن چکا تھا۔ مولانا نے پیشہ معلّیٰ کو ترک کر دیا تھا۔ مسند استفتا پر بیٹھنا چھوڑ دیا تھا۔ شاہانہ کروفر ناپود ہو گیا تھا۔ مولانا کے اس دور کی تصویر جس انداز میں ان کے صاحبزادے نے پیش کی ہے، اس کی اہمیت سوانح روم میں ہمیشہ برقرار رہے گی کہ یہی دراصل ان کی زندگی کا وہ رُخ ہے جس نے انہیں ابدیت عطا کر دی ہے۔ سلطان ولد رقمطراز ہیں:

روز و شب در سماع رقصان شد بر زمین ہچو چرخ گردان شد
 بانگ و فغان او بعرش رسید نالہ اش را بزرگ و خورد شنید
 سیم و زر را بہ مطربان میداد ہر چہ بودش بہ خادمان میداد
 یک زمان بے سماع و رقص نبود روز و شب لفظ نمی آسود
 غلغلہ او فاد اندر شہر شہر چہ در زمانہ و دہر
 کاین چین قطب و مفتی اسلام کوست اندر دو کون شیخ و امام
 شورہا می کند چو شیدا او گاہ پنہان و گاہ ہویدا او
 خلق ازوے ز شرع و دین گشتند ہمہ گان عشق را رہین گشتند
 حافظان جملہ شعر خوان شدہ اند بسوئے مطربان روان شدہ اند

(میرے والد وجد میں شب و روز رقص کناں رہتے۔ زمین پر اس طرح متحرک رہتے جیسے آسمان گردش میں ہو۔ ان کی آواز فغان فلک تک پہنچتی تھی۔ ان کا نالہ ہر کہہ و مہ سنتا تھا۔ گانے والوں پر وہ سیم و زر کی بارش کرتے اور اپنے خادموں کو ہر وہ چیز عنایت کر دیتے جو ان کی تحویل میں ہوتی۔ وہ رقص و سماع کے بغیر ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں رہ پاتے۔ دن رات میں کسی وقت بھی وہ آرام نہیں کر پاتے تھے۔)

شہر میں غوغا پھیلنے لگا۔ شہر ہی نہیں سارا زمانہ اور سارا عالم انقلاب انگیز بن گیا تھا۔ آخر کس طرح وقت کا عظیم قطب، مفتی، شیخ اور امام جنونی کیفیت میں بہتلا ہو گیا ہے۔ وہ لوگ جو شرع اور دین کے داعی اور مبلغ تھے، اب وہ رقص و سرود کے شیدا نظر آ رہے ہیں۔ ہر شخص

موسیقاروں کی طرف راغب دکھائی دے رہا ہے اور عشق کی جانب دیوانہ وار مائل ہوتا جا رہا ہے۔

قارئین! مولانا نے روم کی زندگی کا یہ ایک ٹرننگ پوائنٹ (Turning Point) تھا۔ اگر یہ صورت حال نہ ہوتی تو ہم کیا، پوری دنیا، پورا فارسی ادب، تمام عالمی ادب اس ”رومی“ سے قطعاً آشنا ہوتا جس کے جلیل القدر شعری کارناموں سے دنیا بھر کا ایوان ادب گونج رہا ہے اور یقین واثق ہے، قیامت تک گونجتا رہے گا کہ اس تحریک کے پس پردہ دوسوئی وقت کی ”گرمی عشق“ تندور کا کام دے رہی تھی..... ایک شمس تبریز اور دوسرے ان کے مُرشد بابا کمال الدین جنیدی جنہوں نے اول الذکر کو یہ حکم دیا تھا:

”روم جاؤ۔ وہاں ایک دل سوختہ ہے، اس کو گرم کر آؤ۔“

یہ دیوان جامع اور مثنوی معنوی اسی تندور کی گرمی عشق کا ثمرہ دلفریب و اثر آفریں ہے۔

انتخابِ کلامِ رومی¹

- دیوانِ شمس تبریز
- مثنوی معنوی

1- راقم الحروف نے غزلیاں رومی کا ترجمہ سیدھے سادے انداز میں کیا ہے۔ البتہ مثنوی کا منظوم ترجمہ مولانا ہی کی بحر میں کرنے کی کوشش کی ہے۔ (م۔ر)



بروید ای حریفان بکشید یار ما را
بمن آورید حالا، صنم گریز پا را
اگر او بہ وعدہ گوید کہ دم دگر بباہد
مخورید مکر او را بفریہد او شما را
نہ بہانہ ہائے شیرین، بہ ترانہ ہائے موزون
بکشید کوئے خانہ مہ خوب خوش لقا را¹

1 یہ غزل مولانا نے روم کی ان ابتدائی غزلوں میں ہے جو فراق شمس تبریز میں لکھی گئی تھیں۔ ہم اُسے بلاچون و چرا مولوی معنوی کی شاعری کا "ابتدائیہ" قرار دے سکتے ہیں۔ ان اشعار کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ آگے چل کر ہم جس عظیم المرتبت شاعر کے کلام بلاغت نظام کا مطالعہ کرنے والے ہیں، اس کا Prologue کس غضب کا ہے۔ معلوم ہوتا ہے، حُسن و عشق کی سرمستی ہر مصرعے سے ہویدا ہو رہی ہے۔ وہ رومی جو جذبہ دستار سے مکلف تھے، دیدار تبریز کے بعد جس عالم وارفتگی سے دوچار ہوئے اس کا یہ آغاز جمیل ہے۔

اے دوستو، اے چارہ گرو جاؤ
 اور مرے یار کو بس کھینچ ہی لاؤ
 ہے میرا صنم، یار مرا مجھ سے گریزاں
 ہو جس طرح بھی، تم اسے لاؤ تو یہاں
 اگر کرے یہ وعدہ آؤں گا بعد میں میں
 اور اپنی صورت دکھاؤں گا بعد میں میں
 تو تم یہ سمجھنا وہ فریب دے رہا ہے
 اور حیلہ بازی سے کام لے رہا ہے
 جاؤ اور بیٹھے گیت گا کر
 نغمے حسین سنا کر
 بہانہ رنگیں بنا کر
 میرے چاند سے صنم کو
 میرے گھر کھینچ لاؤ
 (میں اس کا منتظر ہوں!)



معتوقہ بہ سامان شد، تا باد چین بادا
کفرش ہمہ ایمان شد، تاباد چین بادا
ملکی کہ پریشان شد، از شومی شیطان شد
باز آن سلیمان شد، تا باد چین بادا
یاری کہ ولم خستی، دربر رخ ما بستی
غمخوارہ یاران شد، تا باد چین بادا
ہم بادہ جدا خوردی، ہم عیش جدا کردی
نک سردہ مہمان شد، تاباد چین بادا
زان خشم در و غنیش، زان شیوہ شیرینش
عالم شکرستان شد، تاباد چین بادا
از دولت محزونان، و زہمت مجنونان
آں سلسلہ جنبان شد، تاباد چین بادا
عید آمد و عید آمد، یاری کہ رمید آمد
عیدانہ فراوان شد تا باد چین بادا
بر روح برافزودی، تابود چین بودی
فر تو فروزان شد، تاباد چین بادا
غم رفت و فتوح آمد، شب رفت و صبح آمد
خورشید درخشان شد، تاباد چین بادا

معشوقہ پورے جو بن پر ہے، کاش یہ صورت یوں ہی قائم رہے،
 کفر سراسر ایماں میں منتقل ہو گیا ہے، کاش یہ صورت یوں ہی قائم رہے۔
 اگر ملک میں پریشانی کا عالم تھا، تو یہ شیطان کی کارستانی تھی،
 لیکن اب حضرت سلیمانؑ کا زمانہ آ گیا ہے، کاش یہ صورت یوں ہی قائم رہے۔
 کہاں میرا یا میرے دل پر جو رستم کرتا تھا اور اپنا جلوہ نہیں دکھاتا تھا،
 اب دوست کی غم خواری میسر ہے، کاش یہ صورت یوں ہی قائم رہے۔
 ہم اکیلے ہی مے نوشی کرتے اور اس سے لذت اٹھاتے تھے،
 لیکن آج میرا یا مہمان ہے، کاش یہ صورت یوں ہی قائم رہے۔
 تُو نے جو خفگی دکھائی وہ جھوٹی تھی، اور اب تیرا شیوہ خوش آسند ہے،
 یہ شکر کا مقام ہے، کاش یہ صورت یوں ہی قائم رہے۔
 غم زدہ لوگوں کی بدولت اور جنونی افراد کی ہمت کے باعث،
 وہ سلسلہ جنباں ہے، کاش یہ صورت یوں ہی قائم رہے۔
 عید آگئی ہے اور جو دوست کچھڑ گیا تھا وہ بھی آیا ہے،
 غرض عیدی کی فراوانی ہے، کاش یہ صورت یوں ہی قائم رہے۔
 تو روح کے اندر پوشیدہ تھا، اور ایسا ہونا بھی تھا،
 اور اب نور فروزاں ہو چکا ہے، کاش یہ صورت یوں ہی قائم رہے۔
 غم رخصت ہو چکا ہے اور خوشی کی گھڑی آگئی ہے، رات تمام ہوئی اور صبح ہوگئی،
 اور سورج چمکنے لگا ہے، کاش یہ صورت یوں ہی قائم رہے۔



کناری ندارد بیابان ما
قراری ندارد دل و جان ما
جهان در جهان نقش صورت گرفت
کدامست ازین نقش ها آن ما
چو در ره بینی بزیده سری
که غلطان رود سوی میدان ما
ازو پرس ازو پرس اسرارِ دل
کزو بشنوی سرّ پنهان ما
چه بودی که یک گوش پیدا شدی
حریف زبان های مرغان ما
چه بودی که یک مرغ پراں شدی
برو طوق سرّ سلیمان ما
چه گوئیم چه دانم که این داستان
فزونست از حد و امکان ما
چه کھکان چه بازان بهم می پرند
میان هوای کھستان ما

ہمارا بیاباں بے حد بے کنار ہے،
 ہماری روح اور دل کو قرار حاصل نہیں!
 ہر طرف صورتوں کے نقوش نمایاں ہیں،
 ان میں ہمارا کون سا نقش ہے؟
 جب تم راستے میں ایک بریدہ سردیکھو،
 جو ہمارے میدان کی جانب لڑھکتا چلا آ رہا ہے،
 تو اس سے دل کے اسرار معلوم کرو،
 تاکہ تمہیں اس سے ہمارا بھید معلوم ہو جائے گا۔
 یہ کیوں کر ہوا اگر ایک گوشہ بہ تن متوجہ ہو کر،
 چہچہانے والے پرندوں کی آواز سے آشنا ہو جائے۔
 یہ کیوں کر ہوا اگر ایک پرند باز و پھیلائے اڑے،
 اور وہ ہمارے سلیمان کے پر اسرار طوق سے مزین ہو۔
 اس داستان کے بارے میں میں کیا کہوں اور کیا سمجھوں،
 یہ ہمارے حد و امکاں سے بھی پرے ہے۔
 کبک اور باز باہم مل کر اڑ رہے ہیں،
 ہمارے کوہستان کے درمیان!

ای یار ما، دلدار ما، ای عالم اسرار ما
 ای یوسف دیدار ما، اے رونق بازار ما
 نکبر دم امسال ما، خوش عاشق آمد یار ما
 ما مفلسا نیم و توی صد گنج و صد دینار ما
 ما نستگانیم و توی صد مرہم بیمار ما
 ما بس خرابیم و توی ہم از کرم معمار ما
 من دوش گفتم عشق را ای خسرو عیار ما
 سردر مکش، منکر مشو، تو بردہ ای دستار ما
 واپس جوابم دادا، فی از تو ست این کار ما
 چوں ہرچہ گوی و ادھدھ چون صدا کہسار ما

اے مرے یار، تو دل دار ہے اور عالم اسرار ہے،
تو ہی یوسف دیدار ہے اور تو ہی ہمارے بازار کی رونق ہے۔
اس سال ایسی ساعت آئی کہ تجھ سا محبوب آیا،
ہم مفلس اور گدا ہیں اور تو ہی ہمارے لیے سینکڑوں
خزانے اور دینار کی مانند ہے۔

ہم تھک کر چور ہیں اور تو ہی ہم جیسے خستہ و بیمار کے لیے مرہم ہے،
ہم ٹوٹ پھوٹ چکے ہیں اور تو ہی ہمارا مہرباں معمار ہے۔
ہم نے عشق سے کہا کہ اے خسرو عیار ذرا سُن،
اپنا منہ مت چھپا، منکر نہ بن کہ تو نے ہماری دستار چوری کی ہے۔
اس نے یہ سن کر جواب دیا، یہ کام ہمارا نہیں تیرا ہے،
تو جو کچھ کہتا ہے وہی ہمارے پہاڑ سے ٹکرا کر گونجتا ہے۔

یار مرا، غار مرا، عشقِ جگر خوار مرا
 یار توئی، غار توئی، خواجه نگهبان مرا
 نوح توئی، روح توئی، فاتح و مفتوح توئی
 سینہ مشروح توئی، بر در اسرار مرا
 نور توئی، سور توئی، دولت منصور توئی
 مرغ کهنہ طور توئی، خسته بمنقار مرا
 قطره توئی، بحر توئی، لطف توئی، قہر توئی
 قند توئی، زہر توئی، بیش میازار مرا
 حجرہ خورشید توئی، خانہ ناہید توئی
 روضہ اومید توئی، راہ دہ ای یار مرا
 روز توئی، روزہ توئی، حاصل دریوزہ توئی
 آب توئی، کوزہ توئی، آب دہ ای یار مرا
 دانہ توئی، دام توئی، بادہ توئی، جام توئی
 پختہ توئی، خام توئی، خام بملگذار مرا

تم ہی مرے دوست، رفیق، یار غازی ہو
 تم ہی قابل بھروسہ ہو، تم ہی رہبر و رہنما ہو
 تم نوح بھی ہو، روح بھی ہو، فاتح و مفتوح بھی ہو
 تم ہی اسرار و رموز کے پیکر ہو
 تم ہی روشنی بھی ہو اور اظہار بھی
 قطرہ بھی تم ہی ہو، سمندر بھی تم
 لطف بھی تم اور قہر بھی تم، فتنہ بھی اور رند بھی تم
 تم حجرہ خورشید بھی اور خانہ ناہید بھی
 تم ہی جملہ صورتوں میں امید کے محور بھی ہو
 تم ہی مایوس کن حالات میں نجات دہندہ ہو
 آب بھی ہو، کوزہ بھی، دانہ و دوام بھی ہو
 تم ہی بادہ و جام بھی ہو، تم ہی پختہ و خام بھی ہو!

دوش من پیغام کردم سوی تو استاره را
گفتمش خدمت رسان از من تو آن مه پاره را

سجده کردم گفتم آن خدمت بدان خورشید بر

کو بتابش زرکند مر سنگ های خاره را

سینه خود باز کردم زخم ها بنمود مش

گفتمش از من خبر کن دلبر خون خواره را

سو به سو گشتم که تا طفل دلم خامش شود

طفل نحسید چون بجنابند کسی گهواره را

طفل دل را شیرده مارا زگریه اش وارهان

ای تو چاره کرده هر دم صد چومن بیچاره را

شهر وصلت بوده است آخر ز اول جای دل

چند داری در غربی این دل آواره را

من خمش کر دم و لیکن از پی دفع خمار

ساقیا سرمست گردان زگس خماره را

کل میں نے ایک ستارے کو تیرے لیے یہ پیغام دیا،
 اُس چاند کی طرح چمکنے والے محبوب کو میری خبر پہنچا۔
 میں نے سجدہ ریز ہو کر یہ التجا کی کہ اسے سورج تک پہنچا دے،
 جس کی تپش سے سنگ خارہ زر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔
 میں نے پھر اپنا سینہ کھول دیا اور اسے سارے زخم دکھائے،
 اور یہ کہا کہ اس محبوب کو جو خونِ دل پیتا ہے، میرا حال بتانا۔
 میں ادھر ادھر گردش میں رہتا ہوں تاکہ میرا طفلِ دل چپ ہو جائے،
 ایسا اس لیے کرتا ہوں کہ جب پنگورہ گردش میں ہو تو بچہ سو جاتا ہے۔
 میرے طفلِ دل کو دودھ پلا اور مجھے گردش سے نجات دے،
 تو ہی تو ہے جو ہر لمحہ مجھ جیسے سینکڑوں در ماندہ کی مدد کرتا ہے۔
 شہرِ دل اول تا آخر جائے وصل ہی تو ہے،
 آخر تو اس آوارہ دل کو کب تک نظر انداز کرتا رہے گا۔
 میں خاموش تو ہو گیا ہوں، لیکن اے میرے ساتی،
 سر کے خمار کو توڑنے کے لیے آنکھوں کو خمار آلود کر دے۔

ہر نفس آوازِ عشق می رسد از چپ و راست
 ما بہ فلک میر و یم عزم تماشا کر است
 ما بفلک بودہ ایم یار ملک بودہ ایم
 باز ہمان جا رویم خواجہ کہ آن شہر ماست
 خود ز فلک بر تریم و ز ملک افزون تریم
 زین دو چرا نگذریم منزل ما کبریاست
 عالم خاک از کجا گوہر پاک از کجا
 گرچہ فرود آمدیم باز دویم این چہ جاست
 بخت جوان یار ما دادن جان کارما
 قافلہ سالار ما فخر جہان مصطفیٰ ست

آواز عشق ہر لمحہ دائیں اور بائیں سے آرہی ہے،
 ہم سوئے فلک رواں ہیں اور کس میں یہ منظر دیکھنے کا حوصلہ ہے۔
 ہم آسمانوں میں رہے ہیں اور فرشتے ہمارے دوست تھے،
 لہذا ہمیں اب وہاں لوٹ جانا چاہیے کہ وہ اپنا ہی وطن ہے۔
 ہم فلک سے بھی اعلیٰ ترین ہیں اور ملک سے افزوں تر ہیں،
 پھر ہم ان دونوں سے کیوں آگے نہ بڑھیں کہ ہماری منزل تو ذاتِ کبریا ہے۔
 کہاں یہ عالمِ خاک اور کہاں وہ گوہرِ پاک،
 گرچہ ہم نخلی سطح تک آگئے لیکن اس ادنیٰ مقام سے جلد واپس چلنا چاہیے۔
 بختِ جواں ہمارا دوست ہے اور تسلیمِ جاں ہمارا پیشہ ہے،
 اور ہمارے کارواں کے رہنما حضرت مصطفیٰ ہیں جو رونقِ جہاں ہیں۔



آن روح را کہ عشقِ حقیقی شعار نیست
نابودہ بہ کہ بودن او غیر عار نیست
در عشق مست باش کہ عشق ہست ہرچہ ہست
بے کار و بارِ عشق بر یار نیست
عشق است و عاشق است کہ باقیست تا ابد
دل جز برین منہ کہ بجز مستعار نیست
تا کی کنارِ گیری معشوق مردہ را
جان را کنار گیر کہ او را کنار نیست
نظارہ گر مباش درین راہ منتظر
واللہ کہ ہیچ مرگ بتر ز انتظار نیست

یہ کہیں بہتر تھا کہ وہ روح جو محبت کا سچا و صادق
 لبادہ نہیں اوڑھتی، عالم وجود میں نہ آتی۔
 ایسی روح کا وجود سراسر شرم و عار کی حیثیت کا حامل ہے۔
 عشق کی شراب پی کر مدہوش ہو جاؤ،
 اس لئے کہ یہ عشق ہی تو ہے جو قائم و دائم ہے۔
 جب تک عشق میں کامل نہ ہو گے، اس وقت تک محبوب کی رسائی ناممکن ہے۔
 یہ عشق اور یہ عاشق ہے جو تا ابد باقی رہے گا،
 لہذا اپنے دل کو کسی اور سمت نہ لگانا کہ یہ سراسر مستعار ہے۔
 تم کب تک ایک مردہ معشوق کے جسم کو بغل گیر کرتے رہو گے،
 لہذا روح سے ہمکنار ہو کہ اسے کسی چیز نے اپنی گرفت میں نہیں لیا ہے۔
 عشق و محبت کی راہ میں متلاشی نظارہ گر نہ بنو،
 کہ بخدا توقع سے بڑھ کر کوئی شے یہاں بدتر از موت نہیں!



بگیر دامن لطفش که ناگهان بگریزد
ولی مکش تو چو تیرش که از کمان بگریزد
چه نقشها که بازو چه حیلها که بسازد
بنقش حاضر باشد ز راه جان بگریزد
در آزمایش بجوی چو مہ در آب بتاید
در آب چونکہ در آئی باسمان بگریزد
ز لامکانش بجوی نیشان دهد بمکانت
چو در مکانش بجوی بلا مکان بگریزد
چو تیری برود از کمان چو مرغ گمانت
یقین بدان کہ یقین وار از گمان بگریزد
از این و آن بگریزم ز ترس نی ز ملولی
کہ آن نگار لطیفم ز این و آن بگریزد
گریز پائی چو بادم ز عشق گل چو صبا ام
گلی ز بیم خزانی ز بوستان بگریزد
چنان گریزد از تو کہ گر نویسی نقشش
ز لوح نقش پرد و ز دل نشان بگریزد

اس کے دامنِ لطف کو پکڑو، وگرنہ وہ اچانک بھاگ جائے گا،
 لیکن تیر کی مانند اسے نہ کھینچو وگرنہ وہ کمان سے نکل بھاگے گا!
 وہ کیسی کیسی صورت گری اختیار کرتا ہے اور کیسی کیسی چال بازی دکھاتا ہے،
 اگر وہ شکل و صورت میں جلوہ گر ہے تو روح کے راستے نکل بھاگے گا!
 اسے فلک پر تلاش کرو، وہ سطحِ آب پر چمکتا ہے، ٹھیک ماہ ہی طرح،
 اور جب تم اسے پکڑنے پانی میں اترو گے تو وہ آسمان کی جانب بھاگ جائے گا!
 اسے لامکاں میں تلاش کرو گے تو وہ مکانیت کی جانب اشارہ کرے گا،
 اور جب مکاں میں ڈھونڈو گے تو وہ لامکاں کی طرف بھاگ جائے گا!
 جس طرح تیر تیزی سے کمان سے نکلتا ہے، جس طرح تمہارا مرغ گمان اڑتا ہے،
 تو جان لو کہ وہ پیکر یقین حد گماں سے بھی بھاگ جائے گا!
 وہ ایں و آں سے بھاگ نکلے گا، لیکن در ماندگی سے نہیں بلکہ خوف سے،
 اسی طرح میرا نگارِ لطف ایں و آں سے فرار ہو جائے گا!
 جس طرح میں نسیم کی طرح گریز پا ہوں اور صبا کی طرح عاشقِ گل ہوں،
 اسی طرح گلاب کا پھول شدید خزاں میں صحنِ گلشن سے روپوش ہو جائے گا!
 وہ تمہارے وجود سے فرار ہو جائے گا اور اگر تم اس کی تصویر گری کرو گے،
 تو تصویر لوح سے نکل جائیگی اور اس کا تاثر دل سے محو ہو جائے گا!



مرغ و ماهی زمن شده حیران
کاین شب و روز چون نمی چید
پیش ازین در عجب همی بودم
کا سماں نگون نمی چید
آسمان خود کنون زمن خیره است
که چرا این زبون نمی چید
عشق برمن فسون اعظم خواند
دل شنید آن فسون نمی چید

میرے شب و روز جاگتے رہنے پر مرغ و ماہی حیران و ششدر ہیں۔
جب میری ایسی حالت نہیں ہوئی تھی تو میں خود
خمیدہ آسمان کو دیکھ دیکھ کر حیران ہوا کرتا تھا کہ یہ سوتا کیوں نہیں ہے۔
لیکن اب آسمان خود میری زبوں حالی پر حیران ہو رہا ہے۔
عشق کے جذبے نے مجھ پر ایک سحر طاری کر دیا ہے۔
اور اسی فسوں کا اثر ہے کہ میرا دل لمحہ بھر کے لیے بھی نہیں سوتا!



صورتگر نقاشم ہر لحظہ بستی سازم
وانگہ ہمہ بہتارا در پیش تو بگدازم
صد نقش بر انگیزم باروح در آمیزم
چوں نقش ترا بینم در آتشش اندازم
تو ساقیِ خماری یا دشمنِ ہشیاری
یا آنکہ کنی ویران ہر خانہ کہ بر سازم
جان ریختہ شد با تو آمیختہ شد با تو
چوں بوی تو دارد جان جانراہلہ بنوازم
ہر خون کہ زمن روید با خاک تو میگوید
بامہر تو ہمرنگم با عشق تو انبازم
درخانہ آب و گل بی تست خراب این دل
یاخانہ در آ ای جان یا خاتمہ پردازم

میں نقاش ہوں، ہر لمحہ تصویریں بناتا ہوں اور حسن آفریں صورت گری کرتا ہوں،
 لیکن تمہاری موجودگی میں ان سب کو پگھلا کر رکھ دیتا ہوں۔
 میں سو نقش بناتا ہوں اور ان میں جان ڈال دیتا ہوں،
 لیکن جب میں تمہارا نقش دیکھتا ہوں، ان سب کو جلا ڈالتا ہوں۔
 کیا تم مدہوش کر دینے والے ساتھی ہو یا ہوشیار افراد کے دشمن ہو،
 کیا تم وہ شخص ہو کہ میں جب بھی کوئی گھر بناتا ہوں، تم مسمار کر دیتے ہو؟
 تم میں میری روح محلول کر گئی ہے اور تمہاری ذات میں مدغم ہو گئی ہے،
 لوسنو، میں اپنی روح کو عزیز رکھوں گا اس لیے کہ یہ تمہاری خوشبو میں رچی بسی ہے۔
 میرے جسم سے بہتا ہوا ہر خون خاک سے یوں کہہ رہا ہے،
 میں تمہاری ہی محبت کا ایک رنگ ہوں، میں تمہارے ہی لطف کا ایک حصہ ہوں۔
 اس خانہ آب و گل میں یہ دل تمہارے بغیر خراب و خستہ ہے،
 اے میری جان، یا تم اس میں در آؤ یا پھر میں اسے چھوڑ دوں گا!



چه تدبیر اے مسلمانان کہ من خود را نمی دانم
نه ترسا نه یہود من نه گبرم نه مسلمانم
نه شرقیم نه غربیم نه بریم نه بحریم
نه ازکان طیبیم، نه از افلاک گردانم
نه از ہندم نه از چینم نہ از بلغار و سقینم
نه از ملک عراقینم، نه از خاک خراسانم
مکانم لامکان باشد، نشانم بے نشان باشد
نه تن باشد نہ جان باشد کہ من از جان جانانم
دوئی از خود بدر کردم یکے دیدم در عالم را
یکے جویم یکے دانم یکے بینم یکے خوانم

اے مسلمانو! کیا تدبیر کی جائے کہ میں خود سے واقف نہیں ہوں،
 نہ میں عیسائی ہوں، نہ یہودی، نہ گبر ہوں اور نہ مسلمان!
 نہ میں مشرقی ہوں نہ مغربی، نہ میں خشکی سے تعلق رکھتا ہوں اور نہ سمندر سے،
 نہ میرا تعلق فطرت کی کان سے ہے اور نہ ہی مخروطی فلک سے!
 نہ میں ہندوستانی ہوں نہ چینی، نہ بلغاریہ کا ہوں نہ سقین کا،
 نہ ہی میں عراقی سلطنت سے تعلق رکھتا ہوں، نہ ہی خراسانی ہوں!
 لامکاں ہی میرا مکاں ہے اور بے نشانی ہی میرا نشان ہے،
 نہ میرا کوئی جسم ہے نہ جان، میں تو بس اپنے محبوب کے وجود سے تعلق رکھتا ہوں!
 میں نے دوئی کو الگ تھلگ کر دیا ہے اور یہ دیکھا ہے کہ دونوں عالم ایک ہیں،
 بس، میں تو ایک ہی کو ڈھونڈتا ہوں، میں ایک ہی کو جانتا ہوں، میں ایک ہی کو دیکھتا
 ہوں اور ایک ہی کو پکارتا ہوں!

شنیده ام که عزم سفر میکنی مکن
 مهر حریف و یار دگر میکنی مکن
 تو در جهان غریبی و غربت ندیده
 قصد کدام خسته جگر میکنی مکن
 ای مبه که چرخ زیر و زبر از برای تست
 مارا خراب و زیر و زبر میکنی مکن
 کو عهد و کو وثیقه که با ما تو کرده
 از قول و عهد خویش عبر میکنی مکن
 ای برتر از وجود و عدم پاینگاه تو
 این لحظه از وجود گزر میکنی مکن
 ای دوزخ و بهشت غلامان امر تو
 بر من بهشت همچو سقر میکنی مکن
 جانم چو کوره پر آتش بست نکرد
 روی من از فراق چو زر میکنی مکن
 چون روی در کشی تو شومنه زغم سیه
 قصد کسوف قرص قمر میکنی مکن
 ما خشک لب شویم چو تو خشک آوری
 چشم مرا باشک چه تر میکنی مکن

میں نے سنا ہے کہ تم عزم سفر کر رہے ہو۔ ایسا نہ کرو،
 اور اب تم کسی نئے دوست کے ساتھ محبت کی پیٹنگ بڑھانے والے ہو۔ ایسا نہ کرو۔
 تم اس جہاں میں بالکل اجنبی ہو اور تم نے اجنبیت کبھی دیکھی نہیں،
 اے خستہ جگر، تم کس جگہ جانے کا قصد کرنے والے ہو۔ ایسا نہ کرو۔
 اے میرے چاند! یہ آسمان تمہارے لیے ہی زیروز برہور ہا ہے،
 اور اب تم خود مجھے زیروز بر کرنا چاہ رہے ہو۔ ایسا نہ کرو۔
 کہاں گئے وہ وعدے اور عہد و پیمان جو تم نے مجھ سے کیے تھے؟
 اب تم اپنے ہی وعدے و عہد سے پھر رہے ہو۔ ایسا نہ کرو۔
 تمہاری دہلیز تو وجود و عدم کے امکان سے ماورا ہے،
 اور اب تم اپنی ہی زندگی سے ہاتھ دھونے جا رہے ہو۔ ایسا نہ کرو۔
 تم تو وہ ہو کہ دوزخ و بہشت تمہارے زیر فرمان ہیں،
 لیکن تم فردوس کو میرے لیے دکھتی دوزخ بنا رہے ہو۔ ایسا نہ کرو۔
 میرا وجود ایک دکھتی آگ ہے، لیکن تم اس پر بھی خوش نہیں،
 اور اب مجھے اپنے فراق کے صدمے سے زرد و کر رہے ہو۔ ایسا نہ کرو۔
 جب تم اپنے وجود کو چھپاتے ہو تو چاند مارے غم کے سیاہ ہو جاتا ہے،
 تم کیوں چاند کو گہنانے پر تلے ہوئے ہو۔ ایسا نہ کرو۔
 جب تم خشک روئی پر اتر آتے ہو تو میرے لب خشک ہو جاتے ہیں،
 تم آخر میری آنکھوں کو اشک آلود کیوں کر رہے ہو۔ ایسا نہ کرو۔



فقر را در خواب دیدم دوش من
گشتم از خوبی او بیهوش من
از جمال و از کمال لطف فقر
تا سحر گه بوده ام مدہوش من
فقر را دیدم مثال کان لعل
تا ز رنگش گشتم اطلس پوش من
بس شنیدم های و هوی عاشقان
بس شنیدم بانگ نوشا نوش من
حلقہ ای دیدم همه سر مست فقر
حلقہ او دیدم اندر گوش من
بس بدیدم نقشها در نور فقر
بس بدیدم نقش جان در روش من
از میان جان ما صد جوش خاست
چون بدیدم بحر را در جوش من
صد ہزاران نعرہ می زد آسمان
ای غلام همچنان چاوش من

میں نے کل رات خواب میں ایک عارف کو دیکھا،
 اس کی خوبی ہی کو دیکھ کر میں بے ہوش ہو گیا۔
 اس کے جمال اور کمال کا ہی یہ اثر تھا کہ
 میں سحر ہونے تک مدہوش رہا۔
 میں نے عارف کو سرخ ہیروں کی کان کی مانند پایا،
 میں اس کے رنگ اور دمک سے ثروت مند بن گیا۔
 میں نے عاشقوں کا بے طرح شور و غوغا سنا،
 میں نے گھونٹ پر گھونٹ پیتے چلے جانے کی آواز سنی۔
 میں نے ایک ایسی مجلس دیکھی جس میں بھی عارف کے دیوانے تھے،
 اور میں نے اپنے آپ کو اس کا حلقہ بگوش پایا۔
 میں نے عارف کے نور میں بہت سی تصویریں دیکھیں،
 اور اسی نور میں میں نے اپنے محبوب کی تصویر بھی دیکھی۔
 میرے دل کے اندر صد ہا ظلم پیدا ہوئے،
 جب میں نے سمندر کو جوش و خروش کے عالم میں دیکھا۔
 آسمان سے ہزاروں ہزار نعرے بلند ہوئے
 کہ اے بندے تم ہمارے نقیب کی مانند ہو۔



عشق است در آسمان بریدن
صد پرده بهر نفس دریدن
اول نفس از نفس گستن
آخر قدم از قدم بریدن
نادیده گرفتن این جهان را
مردیده خویش را ندیدن
زان سوئے نظر نظاره کردن
در کوچه سیهنا دویدن

فلک کی جانب پرواز کرنا ہی دراصل عشق ہے
 اور ہر لحظہ سینکڑوں پردوں کو چاک کرنا ہوگا!
 اولین لمحے زندگانی سے قطع تعلق کرنا ہوگا
 پھر لمحہ آخر میں قدم کے بغیر سفر طے کرنا ہوگا!
 اس دنیا کو ایک غیر مرئی شے تصور کرنا ہوگا
 اور اپنے وجود پر جو کچھ بھی عیاں ہو، اسے نہ دیکھنا ہوگا!
 حدِ نگاہ سے ماورا نظر ڈالنی ہوگی
 اور آغوشِ (محبوب) کی لہروں میں سرایت کر جانا ہوگا!



اے عاشقان اے عاشقان، ہنگام کو چست از جہان
در گوش جانم می رسد، طبلِ رحیل از آسمان
نک ساربان برخاسته، قطارها آراسته
ازما حلالی خواسته چه خفته اید ای کاروان
این بانگها از پیش و پس، بانگِ رحیلت و جرس
ہر لحظہ ای نفس نفس، سری کشد در لامکان
زین شمعہائے سرنگون، زین پردہ ہائے نیلگون
خلقی عجب آید برون، تا غیبا گردد عیان
ای دل سوئے دلدار شو، ای یار سوئے یار شو
اے پاسبان بیدار شو، خفته نشاید پاسبان
ہر سوی بانگ و مشغلہ، ہر کوی شمع و مشغلہ
کامشب جہان حاملہ، زاید جہان جاودان

اے عاشقو! اب وقت آ گیا ہے کہ دنیا سے کوچ کر جاؤ،
 میرے کانوں میں آسمان سے طبلِ رحیل کی صدا آ رہی ہے!
 وہ دیکھو! ساربان اٹھ کر اونٹوں کی قطار کو آراستہ کر رہا ہے،
 اس نے باز پرس نہ کرنے کے لیے ہم سے قول و قرار کر لیا ہے!
 پس و پیش سے جو صدائیں آ رہی ہیں وہ کارواں کی گھنٹیاں ہیں،
 ہر ذی روح لحظہ بہ لحظہ لامکاں کی طرف مائل پرواز ہے!
 یہ ساری سرنگوں شمعیں اور یہ سارے نیلگوں پردے،
 عجیب خلقت کی صورت نمودار ہوئے ہیں تاکہ غیب عیاں ہو جائے!
 اے دل اب جانبِ محبوب چل، اے دوست اپنے دوست کی جانب گامزن ہو،
 اے پاسباں بیدار ہو جا کہ تیرے لیے خفتہ ہونا نازیبہ ہے!
 ہر طرف شور و غوغا اور ہنگامہ ہے، ہر کوچے میں قندیلیں روشن ہیں،
 کہ آج کی رات یہ جہانِ حاملہ، جہانِ جاوداں کو جنم دے گا!



چو نماز شام ہر کس بنہد چراغ و خوانے
منم و خیال یارے غم و نوحہ و فغانے
چو وضو ز اشک سازم بود آتش نمازم
در مسجد بہ سوزد چو در رسد اذانے
عجباً نمازِ مستان تو بگو دژست ہست آن
کہ نداند او زمانے نہ شناسد او مکانے
عجباً دو رکعت است این عجباً چہارم است این
عجباً چہ سورہ خواندم چو نداشتم زبانے
در حق چگو نہ کویم کہ نہ دست ماند نے دل
دل و دست چون تو بردی بدہ اے خدا امانے
بخدا خبر ندارم چو نماز می گزارم
کہ تمام شد رکوعی کہ امام شد فلانے¹

1 مذکورہ بالا غزل میں مولانا نے روم نے اپنی اس کیفیت کو بیان کیا ہے جو ادا کی گئی نماز کے دوران ان پر طاری ہوئی تھی۔ یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ فارسی اور اردو ادب میں غزل گوئی کو حسن و عشق کے جس محدود دائرے میں مقید کر دیا گیا تھا، مولانا نے اس روایت کو توڑ کر اس صنف سخن کو سینکڑوں سال پہلے ابدیت و انفرادیت عطا کر دی تھی۔

نماز شام کے بعد جب شمعیں روشن کر دی جاتی ہیں اور مسند بچھا دی جاتی ہے،
 اس وقت میں اپنے محبوب کے تصور میں حزن و غم و ملال کے عالم میں کھویا رہتا ہوں!
 میری نماز آتش کی مانند ہے اور میں اپنے اشکوں سے وضو کرتا ہوں،
 اور جب اذان کی آواز سنائی دیتی ہے تو میری مسجد کا دروازہ آتش گیر ہو جاتا ہے!
 مستوں (عاشقوں) کی نماز بھی عجیب و غریب نوعیت کی ہے،
 آپ ہی بتائیے کہ کیا ایسی نماز درست ہے جس میں نہ زماں کی پابندی ہے نہ مکاں
 کی؟

یہ دو رکعتیں اور خصوصی طور پر چار رکعتیں عجیب و غریب نوعیت کی ہیں،
 میں ان میں کوئی سورۃ اپنی زبان کو استعمال میں لائے بغیر ہی پڑھتا ہوں!
 میں درحق پر کس طرح دستک دے سکتا ہوں کہ نہ میرے پاس اس کام کے لیے دل
 گردہ ہے نہ ہاتھ،

یہ دونوں چیزیں اے خدا آپ نے مجھ سے لے لی ہیں لہذا مجھے امان دیں!
 بخدا میں اس بات سے ذرہ برابر واقف نہیں ہوں،
 کہ کس نے امامت کی ہے اور کب رکوع کیا گیا ہے!

ہمرنگ جماعت شو تا لذتِ جان بنی
 در کوی خرابات آ تا درد کشان بنی
 در کش قدح سودا هل تا نشوی رسوا
 بر بند دو چشم سر تا چشم نہان بنی
 بکشائی دو دست خود گر میل کنار سنت
 بشکن بتِ خاکی را تا روی بتان بنی
 از بہر عجوی را چندین چه کشی کابین
 و ز بہر سہ نان تا کی شمشیر و سنان بنی
 شب یار ہی گردد خشنخاش مخور امشب
 بر بند دہان از خود تا طعم دہان بنی
 نک ساقی بے جوری در مجلس او دوری
 در دور در آہنشین تا کی دوران بنی
 این جاست ربا بنگر جانی دہ و صد بستان
 گر گی و سگی کم کن تا مہر شبان بنی
 گفتی کہ فلانے را بہرید زمن دشمن
 رو ترک فلانے کن تاہست فلان بنی

خود کو جماعت کے ہم رنگ بناؤ تا کہ تم روح کی لذت حاصل کر سکو، -
 کوئے میخانے میں داخل ہو جاؤ تا کہ تم پکے شرابی کو دیکھ سکو۔
 خواہشوں کے ساغر کو نچوڑ کر تم شرمندہ نہ ہو گے،
 اور اپنے سر کی آنکھوں کو بند کر دو تا کہ تم پوشیدہ آنکھوں کو دیکھ سکو۔
 اگر تم بغل گیر ہونے کے آرزو مند ہو تو اپنے بازوؤں کو پھیلا دو،
 خاک کی بُت کو توڑ دو تا کہ تم نور مجسم کا چہرہ دیکھ سکو۔
 ایک بوڑھی عورت کی خاطر اس قدر جہیز کا سامان کیوں کرتے ہو،
 اور تین وقت کی روٹی کے لیے کب تک شمشیر و سناں کو دیکھو گے۔
 ہر رات محبوب آتا ہے لہذا تم آج کی رات ایون نہ کھاؤ،
 تم منہ میں کوئی نوالہ نہ لو تا کہ محبوب کے منہ کا ذائقہ چکھ سکو۔
 دیکھو، ساقی ظالم نہیں ہے اور اس کے ارد گرد ایک حلقہ ہے،
 آؤ اور اس حلقے میں بیٹھ جاؤ، کب تک تم سرگرداں رہو گے۔
 دیکھو، یہاں ایک سودے بازی ہے کہ ایک زندگی دے کر سولے لو،
 سگ و گرگ کا و طیرہ چھوڑ دو تا کہ گڈریے کی محبت پاسکو۔
 تم نے کہا کہ دشمن تم سے ایک شخص کو چھین کر لے گیا،
 جاؤ، اس شخص سے دست بردار ہو جاؤ تا کہ تم حصول خدا کی توقع کر سکو۔

اندیشہ مکن الا از خالق اندیشہ
اندیشہ جان بہتر کاندیشہ نان بنی
باوسعت ارض اللہ در جس چه حسپیدی
زاندیشہ گرہ کم کن تا شرح جنان بنی
خاموش شو از گفتن تا گفت بری باری
از جان و جهان بگزر تا جان جهان بنی

فکر و خیال کے خالق کے سوا کسی چیز کا اندیشہ نہ کرو،

روح کی فکر روٹی دال کی فکر سے کہیں بہتر ہے۔

جب خدا کی زمین اتنی کشادہ ہے تو تم قید خانے میں کیوں پڑے سوتے ہو،

اپنے اندیشے کو ختم کرو تا کہ جنت کے حقائق معلوم کر سکو۔

گفتگو کرنے سے باز رہو تا کہ عقلی میں گفتگو کرنے کا اعزاز حاصل کر سکو،

حیات و کائنات سے بے نیاز ہو جاؤ تا کہ تم جانِ جہاں کا مشاہدہ کر سکو۔

یکے گنجے پدید آمد ازیں دکانِ زرکوبی
 زہے صورت، زہے معنی، زہے خوبی زہے خوبی¹

ایدوست بدوستی قرینیم ترا
 ہر جا کہ قدم نہی زمینیم ترا
 در مذہب عاشقی روا کی باشد
 عالم تو بینیم و نہ بینیم ترا

1 مذکورہ بالا شعر افکارِ رومی اور حیاتِ جلال کا ایک شہکار ہے۔ اس کی غنائیت، اس کی لے اور اس کی پرسوزی اپنی مثال آپ ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ مولانا کی زندگی کے ایک تاریخی دور کی بہ حسن و خوبی نمائندگی ہو رہی ہے۔ اور وہ کچھ اس طرح: جب مولانا نے روم کے مرشد طریقت لاپتہ ہو گئے اور اس مخلص مرید کی زندگی طوفانِ غم سے آشنا ہو گئی۔ شب و روز کا گزارنا خاصا مشکل ہو گیا۔ رومی دیوانہ وار قونیہ کی گلیوں میں ناپتے پھرتے تھے۔ معان کے کان میں ایک مدھری آواز آئی۔ وہ ہمہ تن اس طرف متوجہ ہو گئے۔ یہ صدا دراصل ایک زرکوب کی دکان سے آرہی تھی۔ وہ چاندی پر ہتھوڑی کی ضربیں لگا رہا تھا۔ اس آواز میں ایسی مدھرتان تھی کہ مولانا نے روم پر وجد کی کیفیت طاری ہو گئی اور وہ رقص کتاں ہو گئے۔ زرکوب صلاح الدین نے یہ سلسلہ جاری رکھا۔ اور پھر وہ مولانا کا حلقہ بگوش ہو گیا۔

میں نے چاندی سونے کے ورق بنانے والے کی دکان میں ایک خزانہ حاصل کر
لیا۔

کیا ہی خوب اس کی صورت ہے، کیا ہی عمدہ اس کے معنی و مفہوم ہیں اور کیا ہی اچھی
اس کی دلہستگی ہے!



اے دوست! ہم دوستی میں تجھ سے قریب ہیں
جہاں کہیں تیرا قدم پڑتا ہے، ہم سر بسجود ہو جاتے ہیں
مذہب عاشقی میں یہ کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے
کہ ہم ترے خالق کو تو دیکھیں اور تجھے نظر انداز کریں!

○

پرورد نیاز و نعمت آن دوست مرا
بردوخت مرقع از رگ و پوست مرا
تن خرقه و اندر او دل ماصوفی
عالم همه خانقاه و شیخ اوست مرا

○

علمی که ترا گره کشاید بطلب
زان پیش که از تو جان برآید بطلب
آن نیست که هست می نماید بگذار
آن هست که نیست بنماید بطلب

میرے دوست نے نہایت ناز و نعمت سے میری دیکھ بھال کی
اس نے میرے رگ و پوست سے میرا مرقع سی دیا
میرا بدن خرقہ کی مانند ہے اور اس کے اندر میرا دل صوفی کی طرح ہے
تمام عالم ایک خانقاہ کی مثال ہے اور وہ میرا رہنما ہے!

○ ○ ○

تو ایسا علم حاصل کر جو سر بستہ راز کو کھول سکے
قبل اس کے کہ تیری زندگی کا اختتام ہو جائے
اس نیستی کو نظر انداز کر دے جو ہستی کی مانند نظر آتی ہے
اور اس ہستی کو تلاش کر جو نیستی دکھائی دیتی ہے!

○

از کفر و ز اسلام برون صحرائیست
ما را بمیان آن فضا سودائیست
عارف چون بدان رسید سر بنهد
نه کفر نه اسلام نه آنجا جایست

○

بر هر جائیکه سرنهم مسجود او است
برشش جهت و برون زشش معبود او است
باغ و گل و بلبل و سماع و شایه
این جمله بهانه و همه مقصود او است

اسلام اور کفر کے آگے ایک صحرا ہے
ہم وہاں کی فضا پر فریفتہ ہیں
جب غار ف وہاں پہنچتا ہے تو اپنا سرنگوں کر لیتا ہے
گویا اس جگہ نہ کفر ہے اور نہ اسلام!



میں جہاں کہیں بھی سر جھکاتا ہوں، اسی کے آگے سر بہ سجدہ ہوتا ہوں
چاہے چھ اطراف ہوں یا ان چھ سے بھی ماورا ہوں، وہاں وہی ایک ہے
باغ، گل، بلبل، سماع اور معشوق
یہ سب محض بہانہ ہیں اور اصل مقصود وہی ایک ہے!



در مذہب عاشقان قرارے دگر است
دین بادۂ ناب را شمارے دگر است
ہر علم کہ در مدرسہ حاصل کردیم
کارے دگر است و عشق کارے دگر است

عاشقوں کے مذہب میں قرار نام کی چیز ہی اور ہے
اسی طرح شراب کا نشہ بھی ان کے لیے مختلف شے ہے
ہر وہ علم جو ہم مدرسے میں حاصل کرتے ہیں
وہ کام ہی کچھ اور ہے اور عشق چیز ہی کچھ اور ہے!

بشنو از نئے چوں حکایت می کند
 کز نیستان تامرا بریدہ اند
 سینہ خواہم شرح شرح از فراق
 ہر کسے کو دور ماند از اصل خویش
 من بہر جمعیتے نالاں شدم
 ہر کسے از ظن خود شد یار من
 سر من از نالہ من دور نیست
 تن زجان و جاں زتن مستور نیست
 آتش ست این بانگ نائے و نیست باد
 آتش عشق ست کاندر نئے فناد
 نئے حریف ہر کہ از یارے برید
 ہچو نئے زہرے و تریاقے کہ دید
 نئے حدیث راہ پُر خوں می کند
 دو دہان داریم گویا ہچو نئے
 یک دہاں نالاں شدہ سوئے شما
 لیک داند ہر کہ او را منظر ست
 وز جداییہا شکایت می کند
 از نفیرم مرد وزن نالیدہ اند
 تا بگویم شرح درد اشتیاق
 باز جوید روزگار وصل خویش
 جفت خوشحالان و بد حالاں شدم
 وز درون من نہ جبت اسرار من
 لیک چشم و گوش را آن نور نیست
 لیک کس را دید جاں دستور نیست
 ہر کہ این آتش ندارد نیست باد
 جوشش عشق ست کاندر نئے فناد
 پردہایش پردہائے ما درید
 ہچو نئے دمساز و مشتاقے کہ دید
 قصہ ہائے عشق مجنوں می کند
 یک دہان پنهان ست در لبہائے وے
 ہائے و ہوئے در گلندہ در سما
 کایں فغان این سرے ہم زان سرست

بانسری کی یہ حکایت بھی سنو
 کاٹ کر جنگل سے جب لایا اسے
 غم سے پارہ پارہ سینا چاہیے
 اپنے مرکز سے کوئی ہے دور جب
 میں ہر اک مجمع میں روئی ہوں مدام
 ہر کوئی اپنے مطابق یارِ من
 راز میرا نالے کے اندر نہاں
 جان و تن اک دوسرے کے آشنا
 آگ ہے آوازِ نئے، صرصر نہیں
 بانسری میں آگ الفت کی لگی
 سُر فراقِ یار میں ہمدم بنا
 بانسری میں زہر بھی تریاق بھی
 نئے سنائے قصہ راہِ پُرخطر
 مثلِ نئے ہم کو بھی ہیں دو دو دہاں
 رُخ ہے روتے منہ کا لیکن سوئے یار
 آنکھ والا آشنائے راز ہے
 اس کی فرقت کی شکایت بھی سنو
 سن کے نالے سب کے سب گریاں ہوئے
 نالہ سننے کا قرینہ چاہیے
 یاد آئے وصل کا ہر روز و شب
 درمیانِ خرم و محزون عوام
 پر نہ جانے کوئی بھی اسرارِ من
 نُوں چشم و گوش کو حاصل کہاں
 روح کا لیکن ہے مشکل دیکھنا
 آگ سے خالی نہ چپنے گا کہیں
 مے میں کیسی عشق کی تندی چھپی
 دل کا پردہ راگ سے اس کے پھٹا
 بانسری دمساز بھی، مشتاق بھی
 یہ بتائے حالِ مجنوں پُر اثر
 ایک مخفی اس کے لب کے درمیاں
 ہے فلک تک اس کی یہ آہ و پکار
 اُس سرے کی ہی تو یہ آواز ہے

ددمہ ایں نائے ازد مہائے اوست
 گر نبودے نالہ نئے را ثمر
 در غم ما روز ہا بیگاہ شد
 روز ہا گر رفت گورو باک نیست
 در نیابد حال پختہ ہیچ خام
 بادہ در جوشش گدائے جوش ماست
 بادہ ازما مست شدنے ما ازو
 بند بگسل باش آزاد اے پسر
 گر بریزی بحر را در کوزہ
 کوزہ چشم حریصاں پُر نہ شد
 ہر کرا جامہ ز عشقے چاک شد
 شاد باش اے عشق خوش سودائے ما
 اے دوائے نخوت و ناموس ما
 جسم خاک از عشق بر افلاک شد
 سر پہان ست اندر زیر و بم
 آنچہ نئے می گوید اندر ایں دو باب
 با لب و مساز خود گر جہتمے
 ہر کہ او از ہم زبانے شد جدا

ہائے و ہوائے روح از ہیہائے اوست
 نئے جہاں را پُر نہ کر دے از شکر
 روز ہا با سوز ہا ہمراہ شد
 تو بھاں اے آنکہ چون تو پاک نیست
 پس سخن کوتاہ باید والسلام
 چرخ در گردش اسیر ہوش ماست
 قالب ازما ہست شدنے ما ازو
 چند باشی بند سیم و بند زر
 چند گنجد قسمت یک روزہ
 تا صدف قانع نہ شد پُر در نہ شد
 او ز حرص و عیب کلی پاک شد
 اے طبیب جملہ علتہائے ما
 اے تو افلاطون و جالینوس ما
 کوہ در رقص آمد و چالاک شد
 فاش اگر گویم جہاں برہم زخم
 گر بگویم من جہان گرد و خراب
 ہچو نئے من گفتنیہا گفتے
 بے نوا شد گرچہ دارد صد نوا

پھونک سے اس کی ہے نئے میں جل ترنگ
 ہوتی گر فریاد نئے یہ رائیگاں
 غم میں دن برباد کتنے ہو گئے
 دن یونہی گزرے تو گزرے، فکر کیا
 حالِ کامل، ناقصوں کو کیا پتا
 جوشِ بادہ ہے گدائے جوشِ ما
 بادہ ہم سے مست، ہم اس سے نہیں
 اے پسر، بندش کو توڑ آزاد ہو
 تو اگر کوزے میں دریا کو بھرے
 کوزہ چشمِ حریصاں نہ بھرا
 جامہ جس کا عشق سے گر چاک ہے
 اے مرے سودائے عشق رہ شادماں
 نخوت و ناموس کی تو ہی دوا
 عشق سے پہنچا فلک تک جسمِ خاک
 بانسری کے زیرو بم میں ستر نہاں
 جو بھی کہتی ہے یہ نئے دو باب میں
 ہوتی قربت جو لبِ دمساز کی
 ہم زباں سے جو بھی بچھڑا ہے کبھی

اس کی تنبیہ سے صدائے رنگ برنگ
 پر نہ ہوتا شکر سے سارا جہاں
 جان و دل ناشاد کتنے ہو گئے
 پاک ہے جو ذات اس کا آسرا
 مختصر سی بات کر، میں نے کہا
 گردشِ چرخ ہے اسیر ہوشِ ما
 قالب از ماہست، ہم اس سے نہیں
 قیدِ سیم و زر سے چھٹ کر شاد ہو
 ایک دن میں کتنا پانی دے سکے؟
 سیپ قانع جب ہوا، موتی بنا
 جملہ حرص و عیب سے وہ پاک ہے
 ہے شفا تجھ سے طیبِ مہرباں
 تو ہی جالینوس و افلاطونِ ما
 کوہِ رقصاں زیرِ عکس تابناک
 فاش کردوں گر تو ہو برہم جہاں
 گر کہوں، آئے جہاں گرداب میں
 کہہ گزرتا بات میں سب راز کی
 بے نوا ہونے کی حسرت ہی رہی

چونکہ گل رفت و گلستان در گذشت
نور او در یمن و یسرو تحت و فوق
عشق خواهد کاین سخن بیرون رود
آئینہ ات دانی چرا غماز نیست
آئینہ کز زنگ و آلائش جداست
رو، تو زنگار از رخ او پاک کن
این حقیقت را شنو از گوش دل
فہم گر دارید جان را رہ دہید

نشوی زین پس ز بلبیل سرگذشت
بر سر و بر گردنم چون تاج و طوق
آئینہ ات غماز نبود چون بود
زانکہ زنگار از رخ ممتاز نیست
پر شعاع نور خورشید خداست
بعد از ان آن نور را ادراک کن
تا برون آئی بکلی ز آب و گل
بعد از ان از شوق پا در رہ نہید

پھول جب مرجھا گیا، گلشن نہاں
 نور اس کا دائیں بائیں، تحت و فوق
 عشق کی خواہش سخن ہو اب عیاں
 آئینہ غماز کیوں ہوتا نہیں
 آئینہ جو زنگ و آلائش سے پاک
 جا تو اس کے رخ سے زنگ کو دور کر
 اس حقیقت کو سنو از گوشِ دل
 روح کو دو راستہ گر ہو فہیم

سرگذشت بلبلی کی سنا اب کہاں
 گردن و سر میں ہے مثلِ تاج و طوق
 آئینہ تیرا یہ چاہے، ہو نہاں
 زنگ سے بے نور ہے تیری جبیں
 نورِ خورشیدِ خدا سے تابناک
 بعد ازاں تو اکتسابِ نور کر
 تاکہ تم پاؤ نجات از آب و گل
 منتخب کر لو صراطِ مستقیم

بشنوید اے دوستانِ این داستان
 بود شاہے در زمانے پیش ازین
 اتفاقاً شاہ روزے شد سوار
 بہر صیدے می شد او برکوه و دشت
 یک کینرک دید او بر شاہ راہ
 مرغ جانش در قفس چون در طپید
 چون خرید او را و بر خوردار شد
 شہ طبیبان جمع کرد از چپ و راست
 جان من سہل ست و جانِ جانم اوست
 ہر کہ درمان کرد مَر جانِ مرا
 جملہ گفتندش کہ جاں بازی کنیم
 ہر یکے از ما مسیح عالم ست
 گر خدا خواهد نہ گفتند از بطر
 ہرچہ کردند از علاج و از دوا
 آن کینرک از مرض چون مومے شد
 چون قضا آید طبیب ابلہ شود
 خود حقیقت نقدِ حال ماست آن
 مُلکِ دنیا بودش و ہم مُلکِ دین
 باخواصِ خویش از بہر شکار
 ناگہان در دامِ عشق او صید گشت
 شد غلامِ آن کینرک جانِ شاہ
 داد مال و آن کینرک را خرید
 آن کینرک از قضا بیمار شد
 گفت جان ہر دو در دستِ شماست
 درد مند و خستہ ام در مانم اوست
 بُرد گنجِ دُر و مرجانِ مرا
 فہم گرد آریم و انبازی کنیم
 ہر الم را در کفِ ما مرہم ست
 پس خدا بتمود شان عجز بشر
 گشت رنج افزون و حاجت ناروا
 چشمِ شاہ از اشک خون چون جوئے شد
 آن دوا در نفع خود گمرہ شود

دوستو، آؤ سنو یہ داستاں
 اب سے پہلے تھا کہیں اک بادشاہ
 ایک دن وہ بادشاہ ہو کر سوار
 پھر رہا تھا صید کو جب ڈھونڈتا
 راستے میں اس نے دیکھی اک کنیر
 مرغ جاں اس کا تڑپ کر رہ گیا
 اتفاقاً ہو گئی بیمار وہ
 شہ نے حکما کو بلا کر یہ کہا
 یہ کنیر ہے اصل میں جانانِ من
 جس نے میری جان کا درماں کیا
 بولے مل کر ہم کریں گے اب علاج
 ہم میں ہر اک ہے میجائے زماں
 تھا تکبر ان کی باتوں میں چھپا
 جس قدر سب نے علاج اس کا کیا
 وہ کنیرک بال جیسی ہو گئی
 موت جب آئے معالج کیا کرے
 ہے ہمارے حال کی یہ ترجمان
 دین و دنیا دونوں کا وہ سربراہ
 چل پڑا مع دوستاں بہر شکار
 دامِ الفت میں معاً وہ پھنس گیا
 شبہ بنا اس کا غلام، ایسی تھی چیز
 دے کے مال و زر اسے آخر لیا
 فائدہ پہنچانے سے لاچار وہ
 جان ہم دونوں کی محتاجِ شفا
 میں ہوں بیمار اور یہ درمانِ من
 گنجِ موتی اور مرجاں لے گیا
 رکھیں گے اک دوسرے کی ہم تو لاج
 ہاتھ میں ہر درد کا درماں نہاں
 نہ دیا ہر گز خدا کا واسطہ
 دن بدن لیکن مرض بڑھتا گیا
 چشمِ شہہ سے جوئے خوں بہنے لگی
 جاں کنی میں ہر دوا بیکار ہے

شہ چون عجز آن طبیبان را بدید رفت در مسجد سوئے محراب شد
 کائے کمینہ بخششت ملک جہاں حال ما و این طبیبان سر بسر
 چون برآورد از میان جاں خروش در میان گریہ خوابش در ربود
 گفت اے شہ مژدہ حاجاتت رواست چونکہ آید او حکیم حاذق ست
 در علاجش سحر مطلق را بہیں خفتہ بود این خواب دید آگاہ شد
 بود اندر منظرہ شد منتظر دید شخصے کائے پر مایہ
 شہ چو پیش میہمان خویش رفت دست و پیشانیش بوسیدن گرفت
 چون گذشت آں مجلس و خوان کرم قصہ رنجور و رنجوری بخواند
 رنگ رو و نبض و قارورہ بدید دید از زاریش گو زار دل ست
 پا برہنہ جانب مسجد دوید سجدہ گاہ از اشک شاہ پر آب شد
 من چہ گویم چون تومی دانی نہاں پیش لطف عام تو باشد ہدر
 اندر آمد بحر بخشایش بجوش دید در خواب او کہ پیرے رو نمود
 گر غریبے آمدت فردا زماست صادقش داں کو امین و صادق ست
 در مزاجش قدرت حق را بہیں گشتہ مملوک کنیزک شاہ شد
 تا بہ بیند آنچه بنمودند سر آفتابے در میانے سایہ
 شاہ بود و لیک بس درویش رفت و ز مقام و راہ پُرسیدن گرفت
 دست او بگرفت و برد اندر حرم بعد ازاں در پیش رنجورش نشاند
 ہم علامتش ہم اسبابش شنید تن خوش ست و او گرفتار دل ست

شہ نے حکماء کی جو دیکھی بے بسی
 بادشاہ محراب کی جانب گیا
 انے خدا یہ سلطنت بخشش تری
 ہم کو جو لاحق ہوا ہے فکر و غم
 بادشاہ نے دل سے جب فریاد کی
 روتے روتے بادشاہ جب سو گیا
 کہہ رہے تھے آرزو بر آئے گی
 ہو گا وہ لاریب اک حاذق حکیم
 اس کا جادو کی طرح ہوگا علاج
 دفعتاً جاگا وہ شاہ پروتار
 آ کے بیٹھا منظرے میں منظر
 دیکھا آتے ایک پیکر پر ہنر
 شہ لپک کر سامنے اس کے گیا
 دست و پیشانی کو وہ چوما کیا
 کھانا مہمانی کا اس کو جب دیا
 حال سب بیمار کا شہ نے کہا
 نبض و قارورہ و رخ دیکھا گیا
 راز اس پہ کھل گیا بیمار کا
 دوڑ کر مسجد کی اس نے راہ لی
 سجدہ گاہ کو اشک سے پر کر دیا
 تجھ سے پوشیدہ نہیں اک بات بھی
 تیرے لطف عام سے ہو کالعدم
 موج بخشش ہر سو دریا میں اٹھی
 چہرہ دیکھا خواب میں اک پیر کا
 کل ملے گا تجھ سے میرا آدمی
 اس کو تم صادق سمجھنا اور فہیم
 قدرت حق آشنا اس کا مزاج
 تھا جلالت کا لیے سر میں خمار
 تاکہ واضح خواب کا ہو جائے سر
 تھا اندھیرے میں وہ سورج سر بسر
 بن کے سائل اور فقیر بے نوا
 حال پوچھا پھر مقام و راہ کا
 پھر وہ مہماں کو حرم میں لے گیا
 سامنے مہماں کو پھر بٹھلا دیا
 جملہ اسباب مرض پوچھا گیا
 تھی نشانہ عشق کے آزار کا

گفت اے شہِ خلوتی کن خانہ را کس ندارد گوش در دہلیز ہا
دور کن ہم خویش و ہم بیگانہ را خانہ خالی کرد شاہ و شد برون
تا پرسم از کنیزک چیز ہا خانہ خالی کرد و یک دیار نہ
تا بخواند برکنیزک او فسون نرم نرمک گفت شہر تو کجاست
جو طبیب و جز ہماں بیمار نہ دست بر نبضش نہاد و یک بیک
کہ علاج اہل ہر شہرے جداست با حکیم او رازہا می گفت فاش
بازی پرسید از جور فلک سوئے نبض و جنبشش می داشت ہوش
از مقام و خواجگان و شہر تاش سوئے نبض او بر حال خود بد بے گزند
تا پرسید از سمرقند چوقند آہ سردے بر کشید او ماہرو
آب از چشمش رواں شد ہچو جو گفت باز رگام آنجا آورید
خواجہ زرگردراں شہرم خرید در بر خود داشت ششماہ و فروخت
چوں بگفت این ز آتش غم بر فروخت نبض جست و روئے سرخش زرد شد
کز سمرقندی زرگر فرو شد چوں زرنجور آں حکیم این راز یافت
اصل آں درد و بلا را بازیافت گفت کوئے او کدام است و گذر
او سریل گفت و کوئے عاتفر گفت آنکہ آں حکیم با صواب
آں کنیزک را کہ رستی از عذاب من غم تو میخورم تو غم مخور
بر تو من مشفق ترم از صد پدر بعد از اں برخاست عزم شاہ کرد
شاہ را ز اں ثمنہ آگاہ کرد

پھر کہا اے شہ یہ گھر خالی کرو
 بات کرنی ہے کنیزک سے مجھے
 چھوڑا گھر کو، بادشاہ باہر گیا
 ہر مکیں نے کر دیا خالی مکاں
 پھر معالج نے کنیزک سے کہا
 ہاتھ اس کی نبض پہ رکھے ہوئے
 کہتی جاتی تھی سبھی کچھ نیک ذات
 غور سے سنتا تھا وہ باتیں تمام
 نبض جبکہ چلتی تھی مدہم سی چال
 چاند سے مکھڑے نے ٹھنڈی آہ بھری
 بولی تاجر شہر میں لایا مجھے
 چھ مہینے اپنے پہلو میں رکھا
 ذکر جب سونار کا اک دم چھڑا
 پا گیا بوڑھا معالج رازِ دل
 پوچھا اس نے کوچہ و راہ گزر
 تب معالج نے کنیزک سے کہا
 میں ترا غم خوار ہوں تو غم نہ کر
 پھر وہ پہنچا بادشاہ کے سامنے
 یاں کسی بندے کو بھی آنے نہ دو
 نہ سنے کوئی وہ جو کچھ بھی کہے
 افسوں پڑھنے کا اسے موقع دیا
 تھی مریضہ اور معالج بس وہاں
 تو کہاں کی رہنے والی ہے، بتا
 پوچھتا تھا حال وہ بیمار سے
 شہر کی، آقا کی، ہر بستی کی بات
 نبض کی حرکت سے بھی واقف مدام
 پوچھ بیٹھا وہ سمرقند کا بھی حال
 جوئے اشک آنکھوں سے پھر بنے لگی
 پھر خریدا مجھ کو اک سونار نے
 بیچ کر پھر مجھ کو چلتا کر دیا
 چہرہ اس کا زرد ہو کر رہ گیا
 سن لی اس نے آخرش آوازِ دل
 رہ سریل اور نام کوچہ غاتفر
 اب رہائی کا ملا ہے راستا
 مہرباں ہوں تجھ پہ مثلِ سو پدر
 راز بھی بیمار کا کچھ کچھ سنائے

شاه گفت اکنون بگو تدبیر چیست
 گفت تدبیر آن بود کان مرد را
 قاصدے بفرست کاخبارش کند
 مرد زرگر را بخواں زان شهر دور
 تا شود محبوب تو خوشدل بدو
 چوں به بیند سیم و زر آن بے نوا
 زر خرد را واله و شیدا کند
 چونکہ سلطان از حکیم آنرا شنید
 پس فرستاد آن طرف یکدو رسول
 تا سمرقند آمدند آن دو امیر
 نک فلاں شه از برائے زرگری
 اینک این خلعت بگیر و زر و سیم
 مرد مال و خلعت بسیار دید
 اندر آمد شادمان در راه مرد
 اے شده اندر سفر با صد رضا
 چون رسید از راه آن مرد غریب
 شاه دید او را و بس تعظیم کرد
 پس بفرمودش کہ بر ساز و زر

در چنین غم موجب تاخیر چیست
 حاضر آریم از پئے این درد را
 طالب این فضل و ایثارش کند
 بازر و خلعت بدہ او را غرور
 گردد آساں اینہمہ مشکل بدو
 بہر زر گردد زخان و ماں جدا
 خاصہ مفلس را کہ خوش رسوا کند
 پند او را از دل و جاں برگزید
 حاذقان و کافیان و بس عدول
 پیش آن زرگر ز شاہنشہ بشیر
 اختیار کرد زیرا مہتری
 چوں بیائی خاص باشی و ندیم
 غرہ شد از شہر و فرزنداں برید
 پنجر کاں شاہ قصد جانش کرد
 خود پپائے خویش تا سوء القضا
 اندر آوردش بہ پیش شہ طیب
 مخزن زر را بدو تسلیم کرد
 از سوار و طوق و خلخال و کمر

بادشہ بولا کہ کیا تدبیر ہے
 پیر مرد بولا کہ زرگر کو بلائیں
 ایک قاصد بھیج کر بلوائیے
 بھیجے نقد اور خلعت بر ملا
 دیکھ کر زرگر کو خوش ہو جائے گی
 وہ سمرقندی جو دیکھے گا یہ زر
 عقل کو زر اپنا گرویدہ کرے
 جب معالج کی سنی شہ نے یہ بات
 پھر روانہ کر دیے قاصد دو ایک
 پہنچے بالآخر سمرقند وہ امیر
 تجھ کو اک شہ نے برائے زرگری
 لے یہ خلعت، یہ جواہر اور سیم
 دیکھا اس نے خلعت و زر اس قدر
 مرد خوش خوش سوئے سلطان چل پڑا
 کر رہا تھا وہ سفر باصد رضا
 جب مسافر منزلیں طے کر چکا
 شہ نے اس کو دیکھ کر تعظیم کی
 پھر کہا سونے سے کچھ زیور بنا

اب علاجِ غم میں کیا تاخیر ہے
 اس مریضہ کو اسے لا کر دکھائیں
 زر کا بھی لالچ اسے دلوائیے
 شہر چھوڑے اس کی فطرت بر ملا
 آپ کی محبوبہ صحت پائے گی
 اس کی خاطر چھوڑ دے گا اپنا گھر
 مفلسوں کو یہ سدا رسوا کرے
 صدقِ دل سے مان لی شہ نے یہ بات
 کار ساز و ماہر و سرتا پانیک
 آئے زرگر کے قریں شہہ کے سفیر
 چن لیا سن کر تری کاریگری
 آئے گا جب شہہ کا تو ہو گا ندیم
 چھوڑا اس نے شہر و فرزند اور گھر
 بے خبر کہ جان کا سودا یہ تھا
 تھا نہ واقف راستہ ہے موت کا
 سامنے سلطان کے وہ لایا گیا
 زر جواہر دے کے خوب تکریم کی
 ہم کو تو اپنا ہنر زرگر دکھا

زر گرفت آں مردو شد مشغول کار
 پس حکیمش گفت کایے سلطان مہ
 تا کنیزک در وصالش خوش شود
 شہ بدو بخشید آں مہ روئے را
 مدت شہامہ میراندند کام
 بعد ازاں از بہر او شربت بساخت
 چوں ز رنجوری جمال او نماند
 چونکہ زشت و ناخوش و رخ زرد شد
 بے خبر از حالتِ این کار زار
 آں کنیزک را بایں خواجہ بدہ
 آب و صلش دفع این آتش شود
 جفت کرد آں ہر دو صحبت جوئے را
 تا بصحت آمد آں دختر تمام
 تا بخورد و پیش دختر می گداخت
 جان دختر در وبال او نماند
 اندک اندک در دل او سرد شد

عشقہائے کز پئے رنگے بود

عشق نبود عاقبت ننگے بود

سونا لے کر لگ گیا وہ کام میں
 پھر معالج نے یہ سلطاں سے کہا
 نکلے گی وہ آگ کے گرداب سے
 شہ نے اس کی مان لی آخر صلاح
 چھ مہینے دونوں ہم آغوش تھے
 ہو گئی آخر بھلی چنگی کنیر
 پھر معالج نے بنائی اک دوا
 وہ سمرقندی اسے پیتا مدام
 پھر جوانی بالکل ہی جاتی رہی
 ہڈی کا سوکھا سا ڈھانچہ بن گیا
 چاہ لڑکی کو نہ اس سے اب رہی

عشق جو ہوتا ہے بہر رنگ و بو

کرتا ہے آخر میں رسوا کو بہ کو

ہم ز ابراہیم ادہم آمدست
 دلخ خودی دوخت آں سلطانِ جاں
 آں امیر از بندگانِ شیخ بود
 شکلِ دیگر گشت خلق و خلق او
 کو رہا کرد آنچنان ملک شگرف
 ترک کرد او ملکِ ہفت اقلیم را
 ملکِ ہفت اقلیم ضائع می کند
 شیخ واقف گشت از اندیشہ اش
 شیخ سوزن زود در دریا فگند
 صد ہزاران ماہی اللہیے
 گفت الہی سوزنِ خود خواستم
 ماہیے دیگر برآمد در زماں
 سوزنِ او را گرفتہ در دہاں
 رو بدو کردد بگفتش اے امیر
 ملکِ دل بہ یا چنان ملک حقیر

حضرت ادہم کا ہے یہ واقعہ
 آپ دریا کے کنارے بیٹھ کر
 ناگہاں سردار اک آیا وہاں
 ہو گیا حیران و ششدر وہ امیر
 وہ غلاموں میں ادہم کے تھا کبھی
 بلخ کی کیوں چھوڑ دی ہے سلطنت
 اف کہ گڈری سی رہے ہیں بادشاہ
 آپ پر واضح ہوا اس کا خیال
 شیخ نے دریا میں سوئی پھینک دی
 سوئی جو پھینکی ہے لوٹا دے مجھے
 ابھریں پانی پر ہزاروں مچھلیاں
 آپ بولے یہ مری سوئی نہیں
 مجھ کو بس اپنی ہی سوئی چاہیے
 فوراً ہی اک نبھی مچھلی آ گئی
 سن کے ہوتا ہے ہر اک حیرت زدہ
 اپنی گڈری سی رہے تھے بے خبر
 اس نے آنکھوں سے جو دیکھا یہ سماں
 ملک ہفت اقلیم کا شہ اور فقیر؟
 کاسہ لیسوں میں ادہم کے تھا کبھی
 ترک کیوں کی عز و شان و تمکنت
 بے بسی سے جی رہے ہیں بادشاہ
 دل پہ روشن ہو گیا اس کا ملال
 پھر بہ آواز بلند درخواست کی
 میری اپنی چیز پہنچا دے مجھے
 ان کے منہ میں تھیں سنہری سوئیاں
 میں نے دریا میں تو یہ پھینکی نہیں
 جو کہ میں نے ہے ڈبوئی، چاہیے
 منہ میں لے کر اصلی سوئی آپ کی
 پھر کہا یہ آپ نے سردار سے
 ”یہ ہے میری بادشاہت، دیکھ لے“

دید موسیٰ یک شبانے را براہ
 تو کجائی تا شوم من چاکرت
 تو کجائی تاکہ خدمتہا کنم
 جامہ ات شویم سپشہایت کشم
 ورترا بیماری آمد بہ پیش
 دستکت بوسم بمالم پاکت
 اے خدائے من فدایت جان من
 گربدانم خانہ تو من مدام
 ہم پنیر و نانہائے روغنیں
 اے فدائے تو ہمہ بزہائے من
 زیں نمط بیہودہ می گفت آں شبان
 گفت باآں کس کہ مارا آفرید
 گفت موسیٰ ہائے خیرہ سرشدی
 اینچہ ژاژت و اینچہ کفرست و فشار
 گرنہ بندی زین سخن تو خلق را
 گفت اے موسیٰ دہانم دوختی
 کوہمی گفت اے کریم و اے آلہ
 چا رقت دوزم کنم شانہ سرت
 جامہ ات را دوزم و بخیہ زخم
 شیر پشت آورم اے محتشم
 من ترا غم خوار باشم ہچو خویش
 وقت خواب آید بروم جائیکت
 جملہ فرزندان و خان و مان من
 شیر و روغن آرمت ہر صبح و شام
 خم ہائے جوغرات اے نازنیں
 وے بیادت ہی ہی وہیہائے من
 گفت موسیٰ باکیستت اے فلاں
 ایں زمین و چرخ ازو آمد پدید
 خود مسلمان ناشدہ کافر شدی
 پنبہ اندر دہان خود فشار
 آتشے آمد بسوزد خلق را
 وز پشیمانی تو جانم سوختی

دیکھا موسیٰ نے گڈریا راہ میں
 تو کہاں ہے؟ میں ترا نوکر بنوں
 تو کہاں ہے؟ میں تری خدمت کروں
 کپڑے دھوؤں، جوئیں تیری مار دوں
 تو اگر بیمار پڑ جائے کبھی
 ہاتھ چوموں، پیر دابوں میں ترا
 اے خدا یہ میری جاں تجھ پہ نثار
 تیرے گھر کا مجھ کو چل جائے پتا
 میں پنیر اور روٹی لاؤں روغنی
 اے کہ تجھ پہ بکریاں میری فدا
 بات بیہودہ وہ کرتا تھا مدام
 بولے موسیٰ کس سے تو کرتا ہے بات
 جس نے پیدا کر دیا سارا جہاں
 بولے موسیٰ ہائے تو پاگل ہے کیا
 کیسی ہے بکواس اور بے ہودگی
 اب بھی تو نے منہ نہ اپنا بند کیا
 قول موسیٰ کا گڈریے نے سنا
 بات کرتا تھا خدا کی چاہ میں
 جوتا سی دوں سر میں کنگھی بھی کروں
 کپڑا سی دوں، میں تری عزت کروں
 تیرے آگے دودھ کا پیالہ رکھوں
 میں کروں تیمارداری بھی تری
 رات ہوتے ہی لگا دوں بسترا
 جملہ فرزند و مکاں تجھ پہ نثار
 دودھ گھی پہنچاؤں میں صبح و مسا
 پیش کر دوں تجھ کو لا کر میں دہی
 یاد میں تیری ہے یہ آہ و بکا
 تھی نہ اس کے منہ میں کوئی لگام
 بولا خالق سے کہ اعلیٰ جس کی ذات
 مہر و ماہ اور یہ زمین و آسماں
 تو مسلمان ہو کے اک کافر بنا
 اپنے منہ میں ٹھونس لے ظالم روئی
 آگ آ کر دے گی دنیا کو جلا
 شرم سے وہ پانی پانی ہو گیا

جامہ را بدرید و آہے کرد تفت سر نہاد اندر بیابان و برفت
وحی آمد سوئے موسیٰ از خدا بندہ ما را ز ما کر دی جدا

تو برائے وصل کردن آمدی

نے برائے فصل کردن آمدی

کپڑے پھاڑے اور اس نے آہ کی خامشی سے جنگلوں کی راہ لی
حضرتِ موسیٰ پہ آئی پھر وحی بندہ و آقا میں ڈالی ہے جدائی
”تجھ کو بھیجا ہے ملانے کے لیے
نہ کہ بندوں سے چھڑانے کے لیے“

بود بقالے مر او را طویئے
 بر دکاں بودے نگهبانِ دکاں
 خواجہ روزے سوئے خانہ رفتہ بود
 گربہ بر جست ناگہ در دکاں
 جست از صدرِ دکاں بہر گریخت
 از سوئے خانہ بیامد خواجہ اش
 دید پُر روغنِ دکان و جامہ چرب
 روز کے چندے سخن کوتاہ کرد
 ریش برمی کند و می گفت اے ورغ
 دست من بشکستہ بودے آں زماں
 ہدیہ ہا می داد ہر درویش را
 بعدسہ روز و سہ شب حیران و زار
 باہزاراں غصہ و غم گشتہ جفت
 می نمود آں مرغ را ہر گوں شکفت
 دم بہ دم می گفت با او ہر سخن
 خوش نوا و سبز و گویا طویئے
 نکتہ گفتے باہمہ سوداگراں
 در دکاں طوطی نگهبانی نمود
 بہر موشے، طوطیک از بیم جاں
 شیشہ ہائے روغنِ گل را بریخت
 بر دکاں بنشست فارغ شاد و خوش
 بر سرش زد گشت طوطی کل ز ضرب
 مرد بقال از ندامت آہ کرد
 کافاب نعمتم شد زیر میغ
 کہ زدم من بر سر آں خوش زباں
 تا بیابد نطقِ مرغ خویش را
 بر دکاں بنشستہ بد نومیدوار
 کائے عجب ایں مرغ کے آید بگفت
 وز تعجب لب بدنہاں می گرفت
 تاکہ باشد کاندرا آید در سخن

خوش نوا تھی، سبز اس کا تھا لباس
 بات کرتی، آتے جب سوداگراں
 تھی محافظ وہ دکان کی سر بہ سر
 نکلی جاتی خوف سے طوطی کی جاں
 وہ دکان میں ہر طرف دوڑی پھرے
 روغنِ گل کی بہا دیں شیشیاں
 دیکھا بربادی کا ہر سو اک سماں
 سر پہ مارا اس کو گنجا کر دیا
 ہو کے نادم بنے نے اک آہ کی
 اس کو ہوتی تھی خجالت ہر گھڑی
 غصے میں آ کر نہ یوں دھتکارتا
 آہ نعمت کا وہ سورج چھپ گیا
 گنجا کرنے میں نہ دیتا ساتھ یہ
 تاکہ طوطی کے لیے مانگیں دعا
 سوچتا تھا بات کیسی ہے عجیب
 کب میں دیکھوں اس کو فر فر بولتا
 کھیل کرتب سے لبھاتا تھا اُسے
 قصہ کہتا جاتا تھا طوطی سے وہ
 چپ رہا کرتی وہ دن ہو یا کہ رات

ایک طوطی تھی کسی بنے کے پاس
 اصل میں تھی وہ نگہبانِ دکان
 ایک دن مالک گیا تھا اپنے گھر
 ایک بٹی کود کر آئی وہاں
 ایک چوہے کو پکڑنے کے لیے
 اس نے ٹکر سے گرا دیں شیشیاں
 آیا گھر سے جبکہ بقالہ وہاں
 طوطی کی غفلت کا یوں بدلہ لیا
 طوطی نے پھر بات کرنی چھوڑ دی
 خود کو کرتا تھا ملامت ہر گھڑی
 کاش طوطی کو نہ میں یوں مارتا
 اپنی داڑھی وہ یہ کہہ کر نوچتا
 ٹوٹ جاتا کاش میرا ہاتھ یہ
 تحفہ درویشوں کو وہ دیتا رہا
 تین دن گزرے کہ بقالہ غریب
 تھا ہزاروں رنج میں وہ بہتلا
 رنگ برنگی شے دکھاتا تھا اسے
 بات کرتا رہتا تھا طوطی سے وہ
 پر نہ طوطی بولتی تھی کوئی بات

ناگہانی جوقی مہ گذشت باسربے مو چوپشتِ طاس و طشت
طوطی اندر گفت آمد آں زماں بانگ بر رویش زدہ چون عاقلاں
کزچہ اے کل باکلاں آ مینختی تو مگر از شیشہ روغن ریختی

اتفاقاً واں سے گزرا راہ گیر وہ تھا کسبل کو لیٹے اک فقیر
 اس کا سر تھا یا کہ چکنا تھا اس کے چندیے پر نہ اک بھی بال تھا
 گویا بالکل ہی وہ گنجا تھا فقیر صاف آتی تھی نظر سر کی لکیر
 طوطی اس کو دیکھتے ہی بول اٹھی اس نے گڈری پوش کو آواز دی
 عاقلوں کی طرح پوچھا پھر سوال سُن کے سب ہنسنے لگے ہو کر بے حال
 گنجنے! تو گنجنوں میں کیوں شامل ہوا
 تجھ سے بھی کیا روغنِ گل بہہ گیا

اختتامیہ

وہ ربیع الاول 1428ھ کی 13 اور اپریل 2007ء کی 2 تاریخ تھی۔ میں ایک دن قبل ہی قلندر زماں شہزادہ اسد الرحمن قدسی کی تقریب سالگرہ میں شرکت کر کے آستانہ مبارک (بھون) سے واپس آیا تھا۔ صبح 8 بجے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی چلا گیا۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ میرے استاذی المحترم اور سلسلہ نقشبندیہ کے رکن رکیں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان مرحوم کے پوتے اور حضرت کے سجادہ نشین جناب ڈاکٹر حافظ منیر احمد صاحب کا فون آیا۔ کہہ رہے تھے:

”اس مرتبہ بھی حکومت پاکستان نے بارہ ربیع الاول کی پروقا تقریب میں شرکت کے لیے مجھے مدعو کیا تھا۔ آج میں اسلام آباد ہی میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ مغرب بعد، سیٹلائٹ ٹاؤن راولپنڈی میں ذکر اور مراقبے کی روحانی مجلس منعقد ہوگی۔ گزشتہ سال بھی آپ اور چچی (میری اہلیہ) دونوں وہاں تشریف لائے تھے۔ آج ضرور آئیے۔ میں نے چچی سے بھی فون پر گفتگو کی ہے۔“

جب ساڑھے تین بجے یونیورسٹی سے فارغ ہو کر گھر پہنچا تو میری اہلیہ (سیدہ ملیحہ بلخی) میرا انتظار کر رہی تھیں۔ پھر ہم دونوں نے ساتھ مل کر کھانا کھایا۔ انہوں نے درمیانِ طعام حافظ

منیر احمد صاحب کے دعوت نامے کا ذکر کیا۔ کہنے لگیں:

”شامی (بیٹا) اور رابعہ (بہو) عمان میں ہیں۔ شیما (بیٹی) بھی دوہی میں ہے۔
نغمہ (بڑی بیٹی) قطر میں اور فارحہ (چھوٹی بیٹی) جی 9 (اسلام آباد) میں اپنے اپنے گھروں میں
ماشاء اللہ آباد ہیں۔ ایک بیٹا سعدی ہے۔ اسے ہی گاڑی چلانی آتی ہے۔ مگر وہ جیو سے رات
آٹھ بجے تک آئے گا۔ اسی کو حافظ منیر صاحب کی رہائش کا پتہ ہے اور آپ کو نہ تو گاڑی چلانی
آتی ہے اور نہ پتہ ہی یاد رہتا ہے۔ ذکر اور مراقبہ کی مجلس میں مغرب تک جانا بہت مشکل ہے۔
اور پھر رات کھانے پر ہم تینوں فارحہ کے یہاں مدعو بھی ہیں۔ لگتا ہے پنڈی جا کر مراقبہ اور ذکر
میں شرکت کرنا مشکل ہے۔“

ابھی ہم دونوں کھانے سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ اہلیہ کی ملنے والی ایک پڑوسن (انجم)
کچھ میٹھی چیزیں پکا کر لے آئی تھیں۔ پھر کہنے لگیں کہ ”انکل! کوئی روحانی واقعہ سنائیے۔“ میں
نے اسی رات مولانا جلال الدین رومی کی اہلیہ کے راجا خاتون کا بیان کردہ ایک واقعہ زیر نظر کتاب
کے لیے لکھا تھا۔ میں نے وہی انجم کو سنایا اور کچھ اس طرح:

جب حضرت شمس تبریزی اپنے مرشد بابا کمال جندی کے حکم سے قونیہ آئے تاکہ روحانی
گرمی سے جوان رومی کو گرم کر دیں۔ اس وقت مولانا کا بڑا بول بالا تھا۔ بحیثیت صدر مدرس،
بلحاظ مفتی، بہ سبب عالم دین وہ پورے علاقے میں عزت و تکریم کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔
دنیاوی جاہ و حشمت اور مال و منال بھی میسر تھا۔ مگر شمس تبریزی سے ملاقات کے بعد سوائے
بوریاے بوذر اور گوشہ تنہائی کے کچھ بھی نہ تھا۔ گھر کی وہ حالت ماضی برقرار نہ رہی۔ مولانا ہمہ
وقت بند کمرے میں شمس تبریزی کے ساتھ وقت گزارتے تھے۔ اُن کی اہلیہ کو یہ فکر دامن گیر ہوئی
کہ آخر یہ دونوں کمرے میں مقید ہو کر کرتے کیا ہیں؟

چنانچہ نصف شب کو وہ دبے قدموں اس کمرے کے دروازے پر آئیں جہاں مولانا نے
روم اور حضرت شمس تبریزی گوشہ نشین تھے۔ دروازے میں ایک سوراخ تھا۔ اس سے جھانک کر

کر اہاتون نے دیکھا:

مولانا اور ان کے روحانی پیشوا جانماز پر بیٹھے مراقبے میں ہیں اور ذکر کر رہے ہیں۔ پھر انہوں نے تہجد کی نمازیں پڑھیں۔ معاً سامنے کی دیوار پھٹی اور نورانی شکل و صورت کے چھ افراد کمرے میں داخل ہوئے۔ ان میں جو آگے تھے، ان کے ہاتھ میں پھولوں کا بہت بڑا گلدستہ تھا۔ انہوں نے یہ شمس تبریز کو دیا۔ آں بزرگ نے مولانا کو تھما دیا۔ انہوں نے اسے طاقے پر رکھ دیا۔

پھر یہ دونوں..... چھ نو واردوں کے ساتھ جڑ کر بیٹھ گئے اور ذکر و مراقبے میں مصروف ہو گئے، یہاں تک کہ فجر کی نماز کا وقت ہو گیا۔ آٹھوں افراد کھڑے ہوئے۔ نو واردوں نے حضرت شمس سے امامت کرنے کی درخواست کی۔ انہوں نے انکار کر دیا اور مولانا کو حکم دیا کہ نماز پڑھاؤ۔ چنانچہ وہ آگے بڑھے۔ نہایت خضوع و خشوع کے ساتھ نماز پڑھائی۔ میں نے پہلے کبھی اس طرح اپنے شوہر کو امامت کرتے نہیں دیکھا تھا۔ ان کی قرأت اتنی رقت آمیز تھی کہ میں رونے لگی۔

نماز سے فراغت کے بعد چھ کے چھ نو وارد نورانی افراد واپس چلے گئے اور دیوار برابر ہو گئی۔ کچھ دیر بعد مولانا پھولوں کا وہی گلدستہ ہاتھوں میں لیے اندرونِ حویلی آئے اور مجھے یہ دیتے ہوئے فرمایا کہ ”اس گلدستے کا خیال رکھنا۔ یہ جنت کے پھول ہیں۔“

○○○

یہ واقعہ سن کر میری اہلیہ اور انجم دونوں کی آنکھیں پرتھیں۔ رات 9 بجے سعدی میاں جیو سے واپس گھر آئے تو ہم تینوں اپنی بیٹی فارحہ کے گھر کھانے پر چلے گئے۔ 11:30 بجے واپسی ہوئی۔ اہلیہ ادھر عبادت میں مصروف ہو گئیں اور ادھر میں مولانا نے روم والی اس کتاب کے کچھ

جزو لکھنے بیٹھ گیا۔

رات کے ٹھیک دو بجے میرے بیٹے سعدی نے مجھے جگایا کہ امی کی حالت بگڑ رہی ہے۔ میں بھاگ کر ان کے پاس آیا۔ دل میں تکلیف ہو رہی تھی۔ سانس لینے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ وہ میرا دایاں ہاتھ پکڑ کر اپنی کپٹی پر رکھ رہی تھیں..... پھر انہوں نے اپنی انگوٹھی اتار کر بستر پر رکھ دی۔ کلمہ کا ورد کرنے لگیں۔ سورہ یسین پڑھنے لگیں..... سب لوگ جمع ہو گئے تھے۔ ان سبھوں کو کلمہ پڑھنے کی تاکید کر رہی تھیں۔ ہسپتال جانا نہیں چاہتی تھیں اور نہ ونٹی لیٹر لگوانا پسند کرتی تھیں۔ بہر حال، بچوں کے اصرار پر گاڑی میں بیٹھیں۔ پمز ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی اپنی بیٹی فارحہ کی گود میں دم توڑ گئیں۔ انا اللہ.....

حافظ قاری محمود جنہیں وہ اپنا بیٹا کہتی تھیں، وہ اپنے گاؤں اٹک گئے ہوئے تھے۔ وہاں انہوں نے خواب میں دیکھا:

”اتماں جی ایک محل کے سامنے کھڑی تھیں۔ ان کا چہرہ بہت نورانی تھا۔ کہنے لگیں کہ بیٹا اندر آ جاؤ۔ یہ میرا محل ہے۔ اللہ نے مجھ کو بخش دیا ہے۔ ان کے ہاتھوں میں پھولوں کا بہت بڑا گلدستہ تھا، یعنی جنت کے پھول!“

روحانی تعلق بھی خوب ہوتا ہے۔ میں نے سہ پہر میں کرا خاتون والا واقعہ اہلیہ اور انجم دونوں کو سنایا تھا۔ چند ہی گھنٹوں بعد میری رفیق زندگی کو دل کا دورہ پڑا اور وہ راہی ملک عدم ہو گئیں۔ مذکورہ واقعہ میں ”ذکر“ اور ”مراقبہ“ کا تذکرہ تھا۔ پھر پھولوں کے بہت بڑے گلدستے کا! اسی رات سلسلہ نقشبندیہ کے سجادہ نشین حافظ منیر احمد صاحب میری اہلیہ کو خصوصی طور پر ذکر اور مراقبہ میں بلا رہے تھے۔ اس کی تجدید کرا خاتون کے سنائے ہوئے واقعے سے ہو گئی..... پھر چھ نورانی بزرگوں کا لایا ہوا گلدستہ!..... اس کی تصدیق حافظ قاری محمود صاحب کے دیکھے ہوئے اس خواب سے ہو گئی۔

جب میں نے غور کیا تو بات اپنائیت کی نکلی۔ میری اہلیہ سیدہ ملیحہ بلخی حضرت ابراہیم ادہمؒ

کے خاندان سے تھیں اور مولانا جلال الدین رومی کی والدہ بھی اس خانوادہ مقدس کا ایک فرد
تھیں۔ مماثلت تو ہونی تھی، فیض تو پہنچنا تھا اور اکتسابِ نور تو لازمی تھا..... سو یہ سب مولانا نے
روم کی اعلیٰ و افضل روحانیت کا ہی ثمرہ تھا کہ کہاں بلخ، کہاں قونیہ اور کہاں اسلام آباد وانک!

بعد منزل نہ شود در سفر روحانی

محمود الرحمن

کتابیات

اُردو کتب

- 1- احمد الافلاکی : مناقب العارفين ومراة كاشفين، تہران
- 2- احسان الحق : اصول تقيد، لاہور، سن
- 3- بشير محمود اختر (مترجم) : مولانا رومی، حیات و افکار، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور 1979ء
- 4- بدیع الزماں فروزاں فر : سوانح مولوی، تہران، 1325
- 5- خلیفہ عبدالحکیم : حکمت رومی، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، 1955ء
- 6- ایضاً : تشبیہات رومی، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، 1959ء
- 7- رضا زادہ شفق : تاریخ ادبیات ایران، تہران، 1312
- 8- شبلی نعمانی : سوانح مولانا روم، مجلس ترقی ادب، لاہور، 1979ء
- 9- غلام مصطفیٰ خان، ڈاکٹر : اوراق گم گشتہ، حیدرآباد (سندھ)، 1997ء
- 10- مولانا رومی : کلیات دیوان شمس تبریزی، مطبع فولکشور، لکھنؤ، دفتر اول تا ششم، سن
- 11- محمد صدیق خیرآبادی : دانش کدہ، لاہور، 1960ء
- 12- محمد اکرم، ڈاکٹر : کلام اقبال میں تاریخی شخصیات اور ان کے ساتھ اقبال کے ذہنی روابط، تحقیقی مقالہ برائے پی، ایچ، ڈی، 2004ء

13- قاسم صافی، ڈاکٹر : انسان کی ہدایت میں رومی کا کردار، مطبوعہ پیغام آشناء،

اسلام آباد، شمارہ 19، 2004ء

14- اُردو دائرہ معارف اسلامیہ : جلد 7، دانش گاہ پنجاب، لاہور، 1973ء

انگریزی کتب

15. Capt. W.B.S. Rabbani : Islamic Sufims, The science of flight in God, with God, by God and union & communion with God, Lahore, 1984
16. E.H. Whinfield : Rumi, London, 1887
17. E.G. Brown : A Literary History of Persia, London, 1902
18. Chittick, William C : The Sufi Doctrine of Rumi, Tehran, 1974
19. David, Hadland : Rumi, The Persian Mystic, Lahore, n.d.
20. Nicholson, R.A : Mathnawi of Jalaluddin Rumi, Translation & commentary, Lahore, 1989
21. ----- : Rumi, Poet & Mystic. Lahore, 1956
22. Jonathan Star : Rumi, New York, 1977.
23. Coleman Barks : The Essential Rumi, New Jersey, 1995.
24. Encyclopaedia Britannica, : Vol. V, 15ed, Chicago. 1943-1973
25. Mahmudur Rehman : Prominent Personalities of the Muslim World, Islamabad, 1993

مولانا جلال الدین رومی

ڈاکٹر محمود الرحمن

